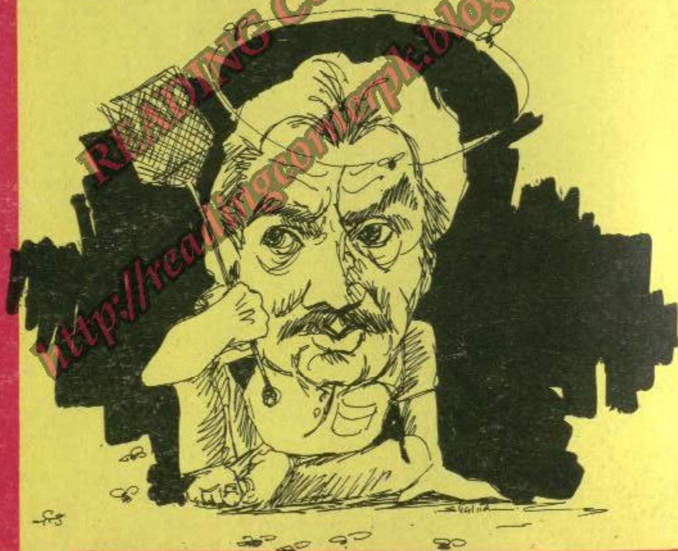
شگفتہ سیریز 9

اور سہی...



چوتھی بار	1997
قیمت	30 روپے
طابع	ابن حسن پرنٹنگ پریس
	ہاکی اسٹیڈیم کراچی

کمپوزنگ

اردو کمپوزرس 34 رمضان چیمبرز بلموریا اسٹریٹ

آئی آئی چندریگر روڈ کراچی۔ فون نمبر 2628517

کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس نمبر 23 رمضان چیمبرز

بلموریا اسٹریٹ۔ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی 74200

روایت

قارئین کی خدمت میں آداب! یوں تو شگفتہ سیریز کے سب ہی ناول دلچسپی اور انفرادیت لیے ہوئے ہیں جیساکہ قارئین کے خطوط سے پتا چلتا رہتا ہے مگر یہ ناول بطور خاص پیش کیا جارہا ہے کہ اس میں دلچسپی کے تمام مسالے موجود ہیں۔ یوں بھی کئی قارئین نے شگفتہ سیریز کو بارہ مسالے کی چاٹ قرار دیا ہے۔

صاحبو! کہا جاتا ہے کہ یہ لڑکیاں نہایت شوخ و شنگ، تیز طرار اور شرارت کی پڑیا ہوتی ہیں۔ پرستاروں کو تنگ کر کے بہت لطف اندوز ہوتی ہیں مگر اس ناول میں ایک ایسے صاحب تشریف فرما ہیں جو کہ یک نہ شد دو شد اکٹھی دو لڑکیوں کو نہایت خوب صورتی اور کمال مہارت سے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ کبھی بزاز بن جاتے ہیں اور کبھی شاعر! مگر ان دونوں میں سے ان کی اپنی چیز کوئی نہیں ہے۔ پارچہ جات والد بزرگوار کے ہیں اور شاعری ایک دوست سے مستعار لی ہوئی ہے۔ ان صاحب کے بارے میں ہم چپکے سے ایک یہ راز کی بات بھی بتا دیں کہ موصوف کبھی کسی امتحان میں کامیاب نہیں ہوئے مگر خیر سے بی اے تک جا پہنچے۔ اب بی اے میں کئی سال سے فیل ہو رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہیں ٹھنڈ ہے۔ اگر آپ کو اس امر پر حیرت ہو رہی ہو تو اس میں آپ کی کم علمی کا دخل ہے تاہم آپ کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے اثر نعمانی صاحب نے کافی روشنی ڈالی ہے۔

دوستو! زمانہ ہی کچھ ایسا آگیا ہے کہ کسی امر پر متعجب ہونا بجائے خود ایک حیرت کی بات ہے اور یہ حیرتوں کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک رشوت، سفارش اور اقربا پروری کی برکتوں کا نزول جاری ہے مگر ہم اچھے دنوں کی امید رکھتے ہیں کہ بارہ برس میں گھورے کے دن بھی پھر جاتے ہیں۔۔۔۔۔

والسلام



کال بیل ایک مرتبہ پھر زور سے چیخی۔

علی احمد صاحب نے شیروانی کے بٹن لگاتے ہوئے بیگم صاحبہ کی طرف دیکھا جو پانوں کی ڈبیا میں سلیقے سے پان رکھنے کے بعد اسے بند کر رہی تھیں۔

"میں کہتا ہوں بیوی' یہ تمہارے لاڈلے صاحب زادے کیا کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے ہیں۔ پانچ منٹ سے برابر گھنٹی بج رہی ہے اور ان کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔"

"رات کو ذرا دیر سے سویا تھا' ممکن ہے ابھی آنکھ نہ کھلی ہو۔" بیگم صاحبہ نے بے پروائی سے جواب دیا "اس کے دوست بھی نگوڑمارے ایسے ہیں کہ صبح دیکھیں نہ شام' دروازے پر کھڑے رہتے ہیں۔"

"غضب خدا کا بیوی' تم اسے صبح کہتی ہو۔ گھڑی تو دیکھو پورے نو بج کر پانچ منٹ ہو چکے ہیں۔ اسکول والے' کالج والے' دفتر والے' کاروبار والے' سب اپنے اپنے کام دھندے سے لگ چکے ہیں مگر جمیل سلمہ ابھی بستر پر ہی اینڈ رہے ہیں۔ اسی لیے کہتا ہوں کہ زیادہ لاڈ پیار اچھا نہیں ہوتا۔"

"تو اسے کون سا دفتر یا دکان جانا ہے۔ کالج بھی آج بند ہے۔"

"آئیں!" احمد علی صاحب چونکے "کیوں صاحب' یہ کالج آج کل کیوں بند ہے' کیا پھر کوئی ہڑتال وڑتال کا چکر چلایا ہے ان لونڈوں نے؟"

"آپ کو تو کچھ یاد ہی نہیں رہتا" بیگم صاحبہ بٹوے میں چھالیہ ڈالتے ہوئے بولیں "اللہ کرے خیر سے بی اے کا امتحان دے چکا ہے اور اب نتیجہ نکلنے کا انتظار کر رہا ہے۔"

"تو گویا سالانہ امتحانات کے بعد کالج کی چھٹیاں ہو چکی ہیں" علی احمد صاحب نے تیز ہوتے ہوئے کہا "مگر میں کہتا ہوں بیوی اگر کالج بند ہے تو پرسوں تمہارے بیٹے نے فیس

کے نام پر جو روپے وصول کیے تھے' وہ کون سے کالج میں جمع کرائے گئے ہیں؟"

گھنٹی ایک بار پھر بجی اور اس مرتبہ بجتی ہی چلی گئی۔

"اُفوہ! وہ بھلا آدمی بھی جب تک بجلی کا ایک یونٹ گھنٹی بجاتے بجاتے ختم نہیں کر دے گا' باز نہیں آئے گا۔ میں کہتا ہوں بیوی' تمہارے لڑکے کو اخراجات بڑھانے کے علاوہ کچھ اور بھی آتا ہے؟ آخر اس گھنٹی کی کیا ضرورت تھی؟ کیا دستک دینے سے اس کے دوستوں کے ہاتھ ٹوٹ جاتے؟ ذرا سوچو تو دو سو روپے کی گھنٹی اور ہر مہینے ہزار روپے کا بجلی کا بل۔ جب کمانا پڑے گا تب معلوم ہو گا کہ خون پسینے کی کمائی کیا چیز ہوتی ہے۔"

"تو کیا ہزار روپے کا بل گھنٹی کی وجہ سے آتا ہے؟" بیگم صاحبہ منہ بنا کر بولیں "ذرا آپ جا کر دیکھ لیں نا کہ کون آیا ہے؟"

"وہ تو جانا ہی پڑے گا ورنہ اس ماہ کا بل دو ہزار روپے سے کم نہیں آئے گا۔" احمد علی صاحب نے جواب دیا اور بڑبڑاتے ہوئے دروازے کی طرف چل دیے۔

دروازہ کھولا تو سامنے شاہد کھڑا تھا۔

"السلام علیکم چچا جان!" شاہد نے انہیں دیکھتے ہی سلام کیا۔

"وعلیکم السلام" احمد علی صاحب نے کہا "میاں' وہ نالائق جمیل تو گدھا ہے مگر تمہیں تو خیال کرنا چاہیے تھا کہ اتنی دیر تک بجلی کی گھنٹی بجانا کیا معنی رکھتا ہے۔ اگر ملنا اتنا ہی ضروری تھا تو ایک مرتبہ گھنٹی بجا کر پھر دستک دینا شروع کر دیتے۔"

"میں نے تو دستک ہی دینے کا ارادہ کیا تھا چچا جان!" شاہد نے سادگی سے کہا "مگر پھر خیال آیا کہ جمیل صاحب ایک دو مرتبہ کھٹکھٹانے سے کہاں سنتے ہیں اور اگر پندرہ بیس منٹ دروازہ پیٹنا پڑا تو اندیشہ ہے کہ کہیں دروازے کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ آج کل لکڑی کتنی مہنگی ہے ایک جوڑی کواڑ دو تین ہزار سے کم میں نہیں آتا۔ یہی سوچ کر میں نے گھنٹی بجانا مناسب سمجھا۔"

"بھئی واللہ! صاحب زادے تم تو ماشاء اللہ سمجھ دار معلوم ہوتے ہو۔" احمد علی صاحب نے کچھ حیرت سے جواب دیا "یہ نکتہ تو میرے دماغ میں بھی نہیں آیا تھا۔ آؤ' اندر آ جاؤ۔ اس حساب سے تو گھنٹی بجانا ہی بہتر ہے۔"

"جی ہاں" شاہد نے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا "مگر ایک بات ہے چچا جان! یہ جمیل اپنے دوستوں کو گھنٹا گھنٹا بھر دروازے پر کھڑا رکھتا ہے۔ میرا خیال ہے آپ سے ملنے والوں کو اتنی زحمت نہیں کرنا پڑتی ہو گی۔"

"بالکل نہیں" احمد علی صاحب نے فوراً جواب دیا "اول تو میں اپنے دوستوں سے ہمیشہ ان کے گھر پر ملنے کا قائل ہوں اور اگر کوئی بھولا بھٹکا غلطی سے آ ہی جاتا ہے تو میں ایک فرلانگ دور ہی سے اس کے قدموں کی چاپ سن لیتا ہوں۔"

"میرا اپنا بھی یہی خیال تھا" شاہد بڑی سنجیدگی سے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "چنانچہ چچا جان! اگر آپ کے دوست گھنٹی بجانے کے بجائے دستک دیں تو زیادہ مفید ہو گا۔"

"واللہ شاہد میاں! تم تو بڑے ہونہار نوجوان معلوم ہوتے ہو۔ مجھے تعجب ہے کہ جمیل تمہارا دوست ہے مگر اس کے دماغ میں یہ قیمتی باتیں نہیں آتیں؟" احمد علی صاحب خوش ہو کر بولے "تو گویا ثابت یہ ہوا کہ جمیل کے دوست آئیں تو بجلی کی گھنٹی اور میرے دوست آئیں تو دستک؟"

"بالکل چچا جان بالکل۔"

"ارے بھئی میں نے کہا سنا تم نے؟" احمد علی صاحب نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے کہا "شاہد میاں نے کیا لاجواب بات کہی ہے۔ میرے احباب آئیں تو دستک اور اس گدھے کے دوست آئیں تو گھنٹی۔ کبھی تمہارے لاڈلے نے باپ کے فائدے کی بات نہیں سوچی ہو گی۔ ہاں صاحب' اپنی اپنی قسمت ہے۔ ایک وہ مائیں بھی ہوتی ہیں جو شاہد جیسے بیٹے جنم دیتی ہیں اور ایک تم ہو تیس سال میں ایک انڈا دیا اور وہ بھی گندا۔"

"اے میں کہتی ہوں بالکل سٹھیا گئے ہو کیا؟ آئے گئے کا بھی خیال نہیں" بیگم صاحبہ نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا "میاں انڈے آپ کے خاندان میں دیتی ہوں گی۔"

"لاحول ولا قوۃ!" احمد علی صاحب کچھ شرمندہ ہو گئے "میرا مطلب تھا کہ ایک بیٹا اور وہ بھی نکھٹو۔"

"السلام علیکم چچی جان!" شاہد نے بمشکل ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"جیتے رہو۔ آؤ بیٹھو۔ جمیل سے ملنے آئے ہو گے؟"

"جی ہاں! آج نتیجہ نکلا ہے نا‘ میں نے کہا جاکر معلوم کر آؤں جمیل کا کیا رہا۔ میں تو آپ کی دعا سے پاس ہو گیا ہوں۔"

"خدا مبارک کرے بیٹے" بیگم صاحبہ خوش ہو کر بولیں "کیا تم نے جمیل کا نمبر اخبار میں نہیں دیکھا؟"

"اس نے مجھے اپنا رول نمبر ہی نہیں بتایا تھا ورنہ ضرور دیکھ لیتا" شاہد نے جواب دیا۔

"دیکھا بیوی! اسے کہتے ہیں ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔" احمد علی صاحب نے تیز لہجے میں کہا "ایک شاہد ہے کہ ماں باپ کا کلیجا ٹھنڈا کر کے دوستوں کو مبارک باد دینے نکلا ہے اور ایک وہ تمہارا سپوت ہے نالائق کہ آج امتحان کا نتیجہ نکلا ہے مگر یوں چادر تان کر سو رہا ہے کہ جیسے اسے کوئی تعلق ہی نہیں۔۔۔ بے پروائی کی بھی حد ہوتی ہے‘ ہزاروں روپے اس گدھے کی پڑھائی پر خرچ ہو چکے ہیں اور اس کا یہ حال ہے کہ آج بھی صبح جلدی نہیں اٹھ سکتا تھا۔ ابھی دیکھتا ہوں جاکر۔"

احمد علی صاحب غصے میں بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ شاہد بھی ان کے پیچھے ہی چلا۔ بیگم صاحبہ بھی جلدی سے پاندان بند کر کے دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

جمیل اپنے کمرے میں واقعی چادر تانے پڑا سو رہا تھا۔ احمد علی صاحب نے جاتے ہی ایک ہاتھ سے چادر گھسیٹی اور دوسرے ہاتھ سے اس کا کان پکڑا اور اٹھا کر بٹھا دیا۔

"تمہیں معلوم تھا کہ آج تمہارا نتیجہ نکلنے والا ہے؟" وہ گرج کر بولے۔

"آپ کو کیا معلوم ڈیڈی!" جمیل نے آنکھیں مل کر جماہی لیتے ہوئے اس طرح کان جھٹکا جیسے گرد جھاڑ رہا ہو "میں آج صبح چار بجے اٹھ کر سیدھا اخبار کے دفتر بھاگا تھا کہ پورے شہر میں سب سے پہلے آپ کے بیٹے کو اپنے پاس ہونے کی خوش خبری معلوم ہو مگر یہ اخبار والے آج کے دن کسی سے سیدھے منہ بات تک نہیں کرتے۔ اخبار کے ایجنٹ اپنا اپنا کوٹہ اٹھا کر چل دیے۔ میں نے ایک ایجنٹ کے ہاتھ پر پیسے رکھے کہ بھیا ایک پرچہ مجھے بھی دیتے جاؤ مگر اس نے جواب دیا کہ آج صرف مستقل گاہکوں کو اخبار دیا جائے گا‘ دوسرے لوگوں کے لیے ایک پرچے کی قیمت بیس روپے ہے۔ کیا کرتا مجبوراً واپس آ کر

سو گیا کہ صبح آپ سے روپے لے کر اخبار لے آؤں گا۔"

"کیا! ایک اخبار کی قیمت بیس روپے؟" احمد علی صاحب چونکے۔

"جی ہاں! اسی لیے کہتا تھا ڈیڈی کہ کم از کم ایک اخبار تو جاری کرا لیں۔" جمیل نے افسردگی سے سہلایا "اب دیکھ لیجیے‘ بی اے کا نتیجہ اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتا‘ جب تک بیس روپے نہ خرچ کیے جائیں۔"

اتنی دیر میں بیگم صاحبہ بھی کمرے میں آ گئی تھیں۔ احمد علی صاحب نے تصدیق کے لیے شاہد کی طرف دیکھا۔

"کیوں شاہد میاں!" انہوں نے پوچھا "یہ نالائق سچ کہہ رہا ہے یا اس بہانے مجھ سے بیس روپے اینٹھنا چاہتا ہے؟"

"مجھے پتا نہیں چچا جان!" شاہد نے جواب دیا "ہمارے ہاں تو اخبار لگا ہوا ہے۔"

"گویا تمہارے یہاں اخبار آ چکا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"تو پھر دوسرا اخبار خریدنے کی کیا ضرورت ہے" احمد علی صاحب نے گھور کر جمیل کی طرف دیکھا "اسی میں اپنا نتیجہ کیوں نہیں دیکھ لیتے؟"

"آپ سمجھتے نہیں ڈیڈی‘ شاہد کے اخبار میں میرا رول نمبر نہیں ہو گا۔"

"کیوں نہیں ہو گا؟"

"اس لیے کہ شاہد نے گورنمنٹ کالج سے امتحان دیا تھا جب کہ میں ایک پرائیویٹ کالج کا طالب علم ہوں۔"

"کیوں شاہد میاں؟" احمد علی صاحب نے پھر شاہد کی طرف دیکھا۔

"یہ آپ بار بار شاہد سے کیا پوچھتے ہیں" بیگم صاحبہ بولیں "آپ کا مطلب ہے کہ جمیل بیس روپے کے لیے جھوٹ بولے گا۔"

"دیکھیے نا امی! اور وہ بھی صبح ہی صبح" جمیل نے جیسے بڑی مظلومیت سے کہا۔

"میں سب سمجھتا ہوں" احمد علی صاحب نے گردن ہلائی "دکان کو دیر نہ ہو رہی ہوتی مجھے تو ابھی شاہد کے گھر جا کر اخبار دیکھ لیتا اور بتا دیتا۔"

"پھر بھی آپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا نتیجہ انگریزی ہی میں شائع ہوتا ہے۔" جمیل آہستہ سے بولا۔

"اچھا اچھا! زیادہ زبان چلانے کی ضرورت نہیں ہے" احمد علی صاحب نے جلدی سے کہا "معلوم ہے کہ تو بہت انگریزی پڑھ گیا ہے۔"

وہ بیگم صاحبہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

"میں دکان جا رہا ہوں' اس گدھے کو بیس روپے دے دینا" یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔

"تم جلدی سے منہ ہاتھ دھولو" بیگم صاحبہ نے جمیل سے کہا "میں تم دونوں کے لیے ناشتا بھیجتی ہوں۔"

"کیوں جناب! یہ صبح ہی صبح مجھے جوتے کھلوانے کا ارادہ تھا کیا؟" جمیل نے ماں کے جانے کے بعد شاہد سے کہا۔

"تو مجھے کیا معلوم تھا کہ سرکار نو بجے تک استراحت ہی فرما رہے ہوں گے۔" شاہد نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "معلوم ہے پندرہ منٹ تک گھنٹی بجاتا رہا ہوں۔"

"غضب کر دیا۔ پھر تو ڈیڈی نے ضرور گھنٹی اتار پھینکی ہوگی" جمیل نے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کہاں چلے؟"

"گھنٹی لگانے۔"

"بیٹھ جاؤ صاحب زادے" شاہد مسکرا کر بولا "گھنٹی اپنی جگہ بدستور لگی ہے اور آئندہ بھی اس کے اکھڑنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

"اچھا! پھر تو کمال ہو گیا" جمیل نے بیٹھ کر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "آج ڈیڈی کچھ زیادہ ہی خوشگوار موڈ میں تھے۔"

"اور ہمیں داد نہیں دو گے؟ کیا لاجواب نکتہ پیدا کیا ہے۔ چچا جان کے دوست آئیں تو دستک اور تمہارے دوست آئیں تو گھنٹی۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" جمیل نے تعجب سے پوچھا۔

جواب میں شاہد نے احمد علی صاحب سے اپنی پوری گفتگو دہرا دی۔

"ہوں..." جمیل سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولا "تو بچو! اب تم بھی ہمارے ڈیڈی کو گھسنے لگے ہو۔"

"یار واقعی چچا جان بہت ہی سیدھے آدمی ہیں۔ مجھے یہی تعجب ہے کہ کاروبار کیسے سنبھالتے ہوں گے؟"

"اپنے کام میں بہت ہوشیار ہیں۔ وہ لچھے دار باتیں کرتے ہیں کہ گاہک سو دکانیں چھوڑ کر انہی کے پاس آتا ہے۔ دکان پر لکھوا رکھا ہے کہ حضرات دھوکا کھانے کہیں اور نہ جائیں' ہماری دکان پر تشریف لائیں۔"

شاہد ہنسنے لگا۔

"اچھا اسے چھوڑو' یہ بتاؤ کیا آج سچ مچ رزلٹ آ گیا ہے؟" جمیل نے پوچھا۔

"بالکل آ گیا ہے' تمہیں نہیں معلوم تھا کیا؟"

"معلوم تو تھا مگر میں نے سوچا کہ جس طرح پہلے اعلان ہو کر تاریخیں ٹلتی رہی ہیں شاید اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہو۔"

"تمہارا کیا رہا؟ پاس تو ہو گئے ہو گے۔"

"پاس...! جناب فرسٹ ڈویژن پاس ہوا ہوں' آپ کی دعا سے۔" شاہد کچھ اکڑ کر بولا

"تم اپنا رول نمبر بتاؤ۔ اخبار میری جیب میں رکھا ہے' میں نے چچا جان کو بتایا نہیں تھا۔" یہ کہہ کر اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے اخبار نکال لیا۔

"چھوڑو یار! پہلے کون سا پاس ہوتے رہے ہیں جو یہ بدعت اس سال ممکن ہوگی" جمیل نے جواب دیا "اور یہ تو تم نے بھی دیکھ ہی لیا کہ ہمارے فیل پاس ہونے سے فرق کچھ نہیں پڑتا۔ چھٹی کلاس سے ساتھ ہے تمہارا۔ تم چھٹی میں حسب عادت پاس ہوئے اور میں حسب معمول فیل۔ مگر خدا پرائیوٹ اسکولوں کو سلامت رکھے' ایک اسکول میں چھٹی میں فیل ہوئے دوسرے اسکول میں ساتویں میں داخلہ لے لیا۔ اس میں ساتویں میں فیل ہوئے تو تیسرے میں جا کر آٹھویں میں نام لکھوا لیا۔ بورڈ کے امتحانات میں رشوت چلتی رہی جو استاد کائیاں ثابت ہوئے ان کے مضامین میں سپلیمنٹری امتحان دے دیا مختصر یہ کہ

تم پاس ہو ہو کر بی ایس سی تک آئے ہو اور ہم ہر سال فیل ہوتے ہوتے بی اے تک پہنچ ہی گئے۔"

"مگر یہ بی اے ہے جناب! یہاں پرانا نسخہ کام نہیں آئے گا۔"

"نہ آئے ہمیں کون سی ملازمت کرنا ہے۔ ٹھاٹ سے ڈیڈی کی دکان پر بیٹھیں گے اور کپڑا بیچیں گے" جمیل نے کہا "ڈیڈی کو اپنے اکلوتے بیٹے کو بی اے کرانے کا شوق تھا تو وہ انہوں نے پورا کر لیا۔ اپنے نام کے آگے بی اے پلکڈ تو لکھ ہی سکتے ہیں۔ ڈیڈی کی اردو کی قابلیت ہی واجبی سی ہے وہ کہاں ڈکشنری میں پلکڈ کا مطلب تلاش کرنے بیٹھیں گے۔"

"یار تم جیسا لاابالی آدمی بھی میں نے نہیں دیکھا۔" شاہد مسکرا کر بولا "اچھا' نمبر تو بتاؤ کیا خبر اس سال بہت سے اندھوں کے ہاتھ بٹیریں لگی ہیں ممکن ہے غلطی سے تمہارا نمبر بھی آگیا ہو۔"

"اچھا دوست' تم نمبر تلاش کرو میں ذرا منہ پر دو چھپاکے مار کر ابھی آتا ہوں" جمیل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نمبر تو بتاتے جاؤ۔"

"پندرہ سو پچانوے" جمیل نے جواب دیا اور باتھ روم کی طرف چل دیا۔

شاہد نے اخبار میں نمبر دیکھنا شروع کیا مگر جیسا کہ جمیل نے کہا تھا' پندرہ سو پچانوے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود کہیں نظر نہیں آیا۔ شاہد نے اخبار تہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ اتنے میں جمیل کی امی ناشتا لے آئیں۔ شاہد گھر سے ناشتا کر کے چلا تھا مگر انہوں نے اتنی شفقت سے اصرار کیا کہ شاہد نے زیادہ انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ جمیل بھی منہ ہاتھ دھو کر آگیا تھا۔ دونوں نے مل کر ناشتا کیا اور جب امی ناشتے کے برتن اٹھا کر لے گئیں تو شاہد نے جیب سے سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھئی' اب میں چلتا ہوں۔ ذرا نصیر اور انور کے گھر بھی جانا ہے۔"

"وہ دونوں تو پاس ہو گئے ہوں گے۔"

"سب تمہاری طرح شہزادے تھوڑی ہوتے ہیں" شاہد مسکرایا "محنت کرتے ہیں پاس ہوتے ہیں۔"

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے پاس ہونا کوئی نعمت عظمیٰ ہو۔ اب دیکھنا تم سب ملازمت کی تلاش میں جوتیاں چٹخاتے پھرو گے اور ہم ٹھاٹ سے دکان پر بیٹھیں گے۔"

"مگر اس شان سے بیٹھے تو ضرور دکان کا بھی کباڑہ کر دو گے' دو چار خوب صورت لڑکیاں روز آگئیں تو ایک ہفتے میں دکان خالی ہو جائے گی۔"

"تو بھیا یہ تو ہو گا" جمیل نے فوراً کہا "اب مجھ سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کوئی کافر ادا مسکرا کر کپڑے کا بھاؤ پوچھے اور میں سچ مچ بھاؤ تاؤ کرنے لگوں۔ جو اپنی خوشی سے دے دے گی لے کر صندوقچی میں ڈال دوں گا۔"

"مجھے بھی یہی خطرہ ہے" شاہد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آج شام کو کہاں مل رہے ہو؟"

"مت بور کرو یار۔ لعنت ہے اس پر جو اب تم سے کہیں ملنے کا پروگرام طے کرے" شاہد یوں بولا جیسے اچانک کوئی بات یاد آگئی ہو "پتا ہے' کل دو گھنٹے تک کلب میں تمہارا انتظار کرتا رہا ہوں۔"

"بھیا' میرا کوئی قصور نہیں" جمیل نے جواب دیا اور گنگنا کر بولا "یہ سب دل کی خطا ہے میں نہیں ہوں۔ میں تو بس سے اتر کر سیدھا وہیں آنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر میں بس سے اترا تو ایک چاند کا ٹکڑا بس میں سوار ہو گیا۔ کیا بتاؤں کیا چیز تھی ظالم۔ ایک نگاہ میں دل' جگر' پھیپھڑے سب کچھ لوٹ کر لے گئی۔ اپنا ہوش نہیں رہا تو تم سے ملنا کیا یاد رہتا۔ مجبوراً دوبارہ بس میں جا بیٹھا اور آخری اسٹاپ کا ٹکٹ لے لیا۔ پھر دیکھا کہ وہ قتالہ عالم پیراڈائز سینما کے اسٹاپ پر اتر رہی ہے۔ میں بھی اتر گیا۔ جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کا رخ سینما کی جانب ہے مجھے معلوم تھا کہ پیراڈائز میں "بن حر" لگے ہوئے ابھی تین چار ہی دن ہوئے ہیں۔ گھڑی دیکھی تو ساڑھے نو بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ یقیناً ہاؤس فل کا بورڈ لگ گیا ہو گا۔ میں نے جلدی سے قدم بڑھائے اور بلیک سے سو روپے میں دو ٹکٹ خرید کر بکنگ کی کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ وہ آئی اور ہاؤس فل کا بورڈ دیکھ کر اس کے خوب صورت چہرے پر مایوسی کی جو کیفیت پیدا ہوئی میرا دل اسے محسوس کر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا کہ اتفاق سے میرے پاس دو ٹکٹ ہیں اور میرا دوست کم بخت ابھی تک

نہیں آیا ہے اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ایک ٹکٹ آپ لے لیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک اجنبی کی اس جرات پر سینڈل نہ سہی اپنا ہینڈ بیگ گھما کر ضرور میرے منہ پر جما دے گی اس لیے بات کرتے ہوئے منہ ذرا فاصلے پر ہی رکھا تھا۔ مگر مجھے تعجب ہوا کہ اس نے مسکرا کر میرا شکریہ ادا کیا اور اس طرح میرے ساتھ بالکنی کی طرف بڑھنے لگی جیسے بہت دنوں سے جانتی ہو۔ میں نے دل میں کہا "صاحب زادے یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔ مچھلی کے شکار میں جب تک ڈور کی کھینچا تانی نہ ہو شکار کا مزہ ہی کیا۔" خیر اندر جا کر بیٹھے۔ فوراً ہی پکچر شروع ہو گئی۔ میں نے اندھیرے میں کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ مجھ سے بمشکل ایک فٹ کے فاصلے پر تھا۔ یہ سائڈ پوز مجھے کچھ دلکش نظر نہیں آیا۔ اچانک میری نگاہ اس کے لمبے لمبے کانوں پر گئی۔ "لاحول ولا قوۃ" میں نے دل میں کہا یہ تو کسی ہتھنی کے کان لگا کر آئی ہے، جلدی سے منہ دوسری طرف کر لیا۔ پنکھے کی ہوا بھی آتی تو یہی شبہ ہوتا کہ اس نے اپنے کان ہلائے ہوں گے۔ بڑی مشکل سے انٹرویل ہوا اور پانچ منٹ کے انٹرویل میں اس نے کمال بے تکلفی سے میرے تیس روپے بھی خرچ کرا دیے۔ جب دوبارہ پکچر شروع ہونے لگی تو میں نے اس سے گزارش کی کہ وہ میری سیٹ پر آ جائے کیونکہ میں پکچر ذرا سائڈ سے دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ وہ اٹھ کر بیٹھنے لگی تھی تو میں نے کہا کہ محترمہ مجھے تو اٹھ جانے دیجیے۔ وہ بولی "اوہ! آئی ایم ساری! میں سمجھی تھی کہ آپ اٹھ چکے ہیں" میں نے دل میں کہا "جنابہ! تیس روپے خرچ کیے ہیں دوسرا سائڈ پوز دیکھے بغیر تو نہیں اٹھوں گا۔" مگر دوسری سیٹ پر بیٹھ کر جو غور کیا تو اس طرف والا کان ادھر سے ایک دو انچ بڑا ہی تھا۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اٹھ کر جانے لگا۔ اس نے کوٹ کا دامن پکڑ لیا کہ کہاں جا رہے ہو؟ "آپ پکچر دیکھیے محترمہ!" میں نے جواب دیا "خدا کی شان دیکھنا تھی سو دیکھ لی۔" اور یہ کہہ کر لاحول پڑھتا ہوا سنیما ہال سے باہر نکل آیا۔ جیب میں بس کے کرائے تک کے پیسے نہیں بچے تھے چنانچہ گھر تک پیدل مارچ کرنا پڑی۔"

"تو پرسوں چچا جان سے فیس (FEES) کے نام سے جو روپے وصول کیے گئے تھے۔ وہ ایک فیس (FACE) پر قربان کر دیے۔" شاہد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیا معلوم!" جمیل نے چونک کر پوچھا۔

"چچا جان' ہی بتا رہے تھے" شاہد نے جواب دیا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ایک کے بعد دوسری لڑکی کے پیچھے وقت اور روپیہ برباد کرنے سے تمہیں حاصل کیا ہوتا ہے۔"

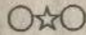
"اور سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیسے شاعر ہو جو لڑکیوں سے اتنا بد کتے ہو۔ معلوم ہے عورت اس دنیا میں حسن فطرت کا بہترین مظہر ہے اور کوئی شاعر جب تک حسن فطرت کا مداح نہ ہو' میں اسے شاعر ہی تسلیم نہیں کر سکتا۔"

"تو میں نے کب کہا ہے بھائی کہ تم مجھے ضرور ہی شاعر تسلیم کر لو۔" شاہد نے جواب دیا "اس کے علاوہ میں تو محض شوق کی خاطر کہتا ہوں۔ شاعر ہونے کا دعویٰ تو میں نے کبھی نہیں کیا۔ بہرحال بات ہو رہی تھی شام کے پروگرام کی اور تم نے اپنی الف لیلہ چھیڑ دی۔"

"اگر امی نے کچھ پیسے دے دیئے تو پھر شام کو اپنے اڈے پر ہی ملیں گے" جمیل نے کہا۔

"کون سے اڈے پر؟ لڑکیوں کی طرح تم اپنے ٹھکانے بھی تو بدلتے رہتے ہو۔"

"وہ تو عارضی اسٹاپ ہوتے ہیں دوست' ورنہ اپنا مستقل اڈہ تو ایک ہی ہے یعنی مون لائٹ کلب۔"



مون لائٹ کلب کا شمار شہر کے بہترین کلبوں میں ہوتا تھا جس کی سب سے بڑی وجہ اس کا محل وقوع تھا۔ شہر کے ہنگاموں سے قدرے دور کلب ایک وسیع پر فضا باغ کے اندر قائم کیا گیا تھا۔ ہر قسم کے ان ڈور اور کچھ آوٹ ڈور گیمز' بہترین مشروبات اور کھانے' مناسب نرخ اور سب سے زیادہ یہ کہ طلبا کے لیے خاص رعایت۔ ان تمام باتوں نے مون لائٹ کلب کو طالب علموں کی پسندیدہ تفریح گاہ بنا دیا تھا۔ یونیورسٹی اور ایک دو کالج کلب سے ایک میل کے فاصلے پر واقع تھے۔

کالجوں میں مون لائٹ کلب کا چرچا عام ہونے لگا چنانچہ دولت مند والدین کے بے فکر فرزندان ارجمند شام کے اوقات میں اگر کہیں ہاتھ نہ آئیں تو مون لائٹ کلب میں ضرور مل جاتے تھے۔

جمیل اور شاہد اسکول کی ابتدائی جماعتوں میں ہم سبق رہ چکے تھے۔ اس زمانے میں

ان کے گھر قریب قریب تھے۔ چنانچہ ہر وقت کے ساتھ نے انہیں ایک دوسرے کا دوست بنا دیا تھا۔ جمیل کی طبیعت میں ابتدا سے ہی بے فکری' لاابالی پن اور ہنسی مذاق شامل تھا۔ جبکہ اس کے برعکس شاہد نسبتاً سنجیدہ مزاج اور احساس ذمے داری کا قائل تھا مگر طبیعتوں کا یہ اختلاف ہی ان کی دوستی کا سبب بن گیا۔ اگرچہ سات آٹھ جماعتوں کے بعد ہی ان کا تعلیمی ساتھ ختم ہو گیا تھا لیکن جمیل اپنی تفریحی دلچسپیوں اور شاہد اپنی تعلیمی مصروفیتوں میں کچھ تنوع پیدا کرنے کے لیے دن میں کچھ نہ کچھ وقت ضرور ساتھ گزارا کرتے تھے۔ جمیل کے والد احمد علی صاحب کپڑے کے ایک کامیاب بزنس مین تھے۔ صدر بازار میں ان کی خاصی بڑی دکان تھی اور ادھر دو چار برسوں سے کاروبار اتنا پھیل گیا تھا کہ انہیں اپنی مدد کے لیے تین سیلز مین بھی رکھنا پڑے تھے مگر کافی آمدنی کے باوجود ان کی طبیعت میں کنجوسی کی حد تک کفایت شعاری شامل تھی۔ پڑھے لکھے صرف اتنے تھے کہ دکان کا حساب کتاب کر لیتے تھے۔

گھر اور گھر سے دکان کے چکر نے عام دنیاوی معاملات میں ان کے تجربے کو خاصا محدود رکھا تھا۔ اسی لیے بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح واقع ہوئے تھے۔ البتہ جہاں تک ان کے کاروبار کا تعلق تھا وہ کسی ہوشیار سے ہوشیار بزنس مین سے کم نہیں تھے۔ جمیل ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ یوں ہونے کو کئی بچے اور بھی ہوئے مگر بدقسمتی سے زندہ نہ رہ سکے۔ اس کے مقابلے میں شاہد کے والد زاہد علی خاں صاحب اپنے زمانے میں بڑے ٹھاٹ سے پولیس انسپکٹری کرنے کے بعد ریٹائر ہو چکے تھے اور جیسا کہ عام طور پر پولیس والوں کے ساتھ ہوتا ہے' آخری عمر میں گزشتہ اعمال کا حساب کتاب برابر کرنے کے لیے بڑی شدت سے مولانا بنتے جا رہے تھے۔ شاہد دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ ماں کی طرف سے اسے سلجھا ہوا ذہن اور اعتدال پسند طبیعت ملی تھی اور ارادے کی مضبوطی اور ذمے داریوں کا احساس خان صاحب سے پایا تھا اور دونوں طرف سے ملنے والے ان اچھے اوصاف نے اسے اپنی عمر کے نوجوانوں میں ایک قابل قدر کردار کا مالک بنا دیا تھا۔

جمیل نے مون لائٹ کلب کے وسیع ہال میں داخل ہو کر ایک سرسری نظر سے چاروں طرف دیکھا بیشتر میزیں گھری ہوئی تھیں۔ پرائیویٹ کیبن بھی آباد نظر آ رہے تھے۔

شاہد ابھی نہیں آیا تھا۔ اچانک جمیل کی نگاہ ہال کے گوشے میں پڑی ہوئی ایک میز کی طرف گئی۔ اس میز پر چار لڑکیاں بیٹھی ہوئی چائے پی رہی تھیں۔ یوں تو سب ہی قبول صورت تھیں مگر ان میں فیروزی ساری والی جمیل کو زیادہ پسند آئی۔ اس نے آس پاس کی میزوں کا جائزہ لیا۔ ایک میز جو نظارہ بازی کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہو سکتی تھی اس پر چار پانچ لڑکے پہلے ہی قبضہ جمائے بیٹھے تھے اور لڑکیوں کی طرف دیکھ دیکھ کر خواہ مخواہ بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ جمیل ان سب کو اچھی طرح جانتا تھا۔ جہاں تک منیر' رشید اور ایوب کا تعلق تھا' یہ تینوں لیموں نچوڑ اور چچوں کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ دولت مند اور دھاکڑ قسم کے لڑکوں کی ہاں میں ہاں ملانا ان کی عادت تھی۔ اگر صرف وہ ہی بیٹھے ہوتے تو جمیل کو اتنا سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بلا تکلف ان کی میز پر بیٹھ سکتا تھا مگر پریشانی یہ تھی کہ اس وقت وہاں اکبر بھی موجود تھا اور جب سے وہ کالج یونین کے جنرل سیکریٹری کے انتخابات میں جمیل سے ہارا تھا' دشمنی پر اتر آیا تھا۔ جمیل کو خواہ مخواہ کی ہاتھاپائی بالکل پسند نہیں تھی۔ وہ حریف کو اپنی ذہانت اور حاضر دماغی سے شکست دینے کا قائل تھا۔

"یہاں کھڑے ہوئے کیا کر رہے ہو؟" اتنی دیر میں شاہد بھی آ گیا تھا۔ "کیا کوئی میز خالی نہیں ہے؟"

"میزیں تو کئی خالی ہیں مگر میں جس میز پر بیٹھنا چاہتا ہوں اس پر اکبر نے قبضہ کیا ہوا ہے" جمیل نے شاہد کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔

"کون سی میز؟" شاہد نے پوچھا۔

"وہ اس طرف کونے میں" جمیل نے نگاہوں کے اشارے سے بتایا۔

"کیوں' اس میز میں کیا خصوصیت ہے؟" شاہد نے ابھی لڑکیوں کی طرف توجہ نہیں دی تھی مگر یہ الفاظ کہتے کہتے اس نے بھی دیکھ لیا۔ "رہنے دو جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے" وہ جلدی سے بولا "میں سمجھ گیا۔"

"سمجھ گئے نا؟" جمیل مسکرایا "ہوشیار ہوتے جا رہے ہو۔"

"اب تم کوئی ہنگامہ کھڑا کرو گے؟"

"بالکل نہیں۔"

"گویا تمہارا خیال ہے کہ اکبر انہیں دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ جائے گا کہ آیئے حضور والا' میں نے یہ کرسی تو صرف آپ کے لیے روکی ہوئی تھی ورنہ میرا کیا ہے' میں تو گھوم پھر کر بھی نظارہ جمال کر سکتا ہوں۔"

"تم دیکھتے جاؤ ابھی پانچ منٹ میں وہ منہ سے نہ سہی مگر عملاً یہی سب کچھ کرنے والا ہے" جمیل نے جواب دیا اور ہال کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

"کہاں جارہے ہو؟" شاہد نے تعجب سے پوچھا۔

"ابھی آتا ہوں" جمیل نے پلٹ کر کہا اور تیز تیز قدموں سے ہال سے باہر نکل گیا۔

اس نے پہچان لیا تھا کہ ان تین لڑکیوں میں ایک کرسچن لڑکی ہیلن بھی تھی جس کا رومان جمیل کے ایک باکسر دوست جان محمد سے چل رہا تھا۔ ہال کے باہر برآمدے میں ایک پبلک فون بوتھ لگا ہوا تھا۔ جمیل نے فون بوتھ میں داخل ہو کر احتیاط سے دروازہ بند کیا اور ہال کی جانب سے پشت کرتے ہوئے مطلوبہ سکہ ڈال کر کلب کا نمبر ڈائل کیا۔ پہلی ہی گھنٹی پر کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے بارمین نے ریسیور اٹھایا "ہیلو' مون لائٹ کلب" جمیل نے اس کی آواز سنی۔

"دیکھیے آپ کے ریسٹورنٹ ہال میں سترہ نمبر میز پر ایک خاتون مس ہیلن بیٹھی ہوں گی" جمیل نے آواز بدلتے ہوئے کہا "ذرا انہیں فون پر بلا دیں۔"

"بہت اچھا۔ ایک منٹ ہولڈ کریں۔ میں دیکھتا ہوں مس ہیلن موجود ہیں یا نہیں۔"

جمیل نے جیب سے ایک چیونگم نکال کر منہ میں رکھ لیا۔

"ہیلو؟" تقریباً ایک منٹ کے وقفے کے بعد ہیلن کی آواز ابھری "ہو از اٹ؟"

"ہیلو' ہیلن ڈارلنگ!" جمیل نے جان محمد کی طرح منہ چلاتے ہوئے بالکل اسی کے لب ولہجے میں کہا۔

"اوہ! جان۔ یونانی بوائے۔ میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ آج میں ستارہ کے ساتھ کلب جارہی ہوں۔۔۔"

"سنو ڈارلنگ!" جمیل نے اس کی بات کاٹ دی "مجھے بن حر کے دو پاس مل گئے ہیں۔ شو ساڑھے چھ بجے شروع ہوتا ہے اور اس وقت سوا چھ بجے ہیں میں ٹیکسی پکڑ کر

کلب آرہا ہوں تم مجھے کلب کے گارڈن روڈ والے گیٹ پر ملو۔"

"اوہ ہاؤ ونڈر فل جان ڈیئر!" ہیلن نے چیختی ہوئی آواز میں کہا "مگر میں ستارہ اور فوزیہ سے کیا کہوں گی؟"

"ان سے یا کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ فوراً گیٹ پر پہنچو۔ میں زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ میں آرہا ہوں۔"

اور اس سے پہلے کہ ہیلن کوئی جواب دیتی' جمیل نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب ہیلن میز پر بھی واپس نہیں جائے گی نہ صرف اس لیے کہ جمیل نے اسے وقت بہت کم دیا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ ہیلن جانتی تھی کہ اگر وہ نہیں گئی تو جان محمد' روبی کے ساتھ چلا جائے گا جو آج کل اس کی توجہ کا مرکز بننے کے لیے پوری کوشش کر رہی تھی۔

جمیل کا اندازہ درست ہی نکلا۔ ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ ہیلن کھٹ کھٹ کرتی ہوئی برآمدے میں آئی اور کسی طرف دیکھے بغیر تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی کلب کے گارڈن روڈ والے گیٹ کی طرف گھوم گئی۔ جمیل نے فوراً دوسرا سکہ ڈالا اور دوبارہ کلب کا نمبر ڈائل کیا اور اس مرتبہ اکبر کو بلایا۔

"کون ہے؟" اکبر کی آواز ابھری۔

"تم کتنے پتھر دل ہو اکبر ڈیئر" جمیل نے بالکل کسی لڑکی کی طرح باریک اور لچکیلی آواز میں کہا "جو تم پر جان دیتی ہے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور جسے تمہاری اتنی سی بھی پروا نہیں' اس کے لیے اپنے دلکش قہقہے ضائع کر رہے ہو۔ میں بڑی دیر سے دیکھ رہی تھی کہ تم فوزیہ کی توجہ حاصل کرنے کے لیے دوسری میز پر بیٹھے ہوئے بار بار ہنس رہے تھے مگر وہ بڑی مغرور اور نک چڑھی لڑکی ہے۔ پتا نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔ اس نے تمہارے متعلق ایک ایسی بات کہی کہ میں برداشت نہیں کر سکی اور اٹھ کر چلی آئی۔ تم نے تو مجھے جاتے ہوئے دیکھا ہوگا۔"

"اوہ' تم ہو ہیلن ڈارلنگ!" اکبر نے جلدی سے کہا۔

"تھینک گاڈ! تم نے میری آواز تو پہچان لی۔"

"مگر میں نے تو سنا تھا کہ تم اس باکسر سے۔۔۔"

"ارے وہ ابوالہول کا بت بھی کہیں محبت کرنے کے قابل ہے اسے تو میں بے وقوف بنا رہی ہوں۔"

"سچ کہہ رہی ہو؟" اکبر کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔

"مجھے تم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔" جمیل بڑی عمدہ صداکاری کر رہا تھا "مگر تم جانتے ہو کہ لڑکی خواہ کتنی ہی فیشن ایبل اور ماڈرن کیوں نہ ہو، محبت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی زبان ہمیشہ لڑکھڑا جاتی ہے۔ اس وقت بھی اگر تم میرے سامنے کھڑے ہوتے تو میں سب کچھ ہرگز نہیں کہہ سکتی تھی اور اب جبکہ میں نے اپنا دل تمہارے قدموں میں ڈال دیا ہے مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ تم اسے قبول کرو گے یا ٹھکرا دو گے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو ہیلن ڈارلنگ!" اکبر بڑے جوش کے ساتھ بولا "تمہاری محبت پا کر میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی سمجھوں گا۔"

"تو پھر سمجھو کہ تم دنیا کے سب سے بڑے خوش نصیب ہو" جمیل نے کہا "میں کلب کے گارڈن روڈ والے گیٹ پر تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

"میں ابھی آتا ہوں ڈارلنگ۔"

"ایک بات کا خیال رکھنا۔ مجھے تمہارے سامنے پھر شرم آجائے گی۔ اتنا حوصلہ نہیں ہوگا کہ تم سے مخاطب ہو سکوں۔ تم مرد ہو، فرسٹ اسٹیپ بہرحال تمہیں اٹھانا چاہیے اور یہ بھی یاد رکھنا کہ عورت جب نا کہتی ہے تو اس کا مطلب ہاں ہوتا ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

اور یہ کہہ کر جمیل ریسیور ہک میں لٹکا کر جلدی سے فون بوتھ سے باہر نکل آیا۔ ابھی وہ نکلا ہی تھا کہ اکبر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر آیا اور تقریباً بھاگتا ہوا گارڈن روڈ والے گیٹ کی طرف چلا گیا۔ جمیل نے اپنی شرارت کے لیے اس گیٹ کو منتخب کرنے میں بڑی ہوشیاری سے کام لیا تھا۔ کلب آنے والے تقریباً سب ہی ممبر مین گیٹ سے آتے جاتے تھے۔ گارڈن روڈ والا گیٹ صرف ان لوگوں کی سہولت کے لیے تھا جن کا کوئی میچ وغیرہ ہو رہا ہوتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کلب کے ٹینس اور بیڈمنٹن کورٹ اسی طرف واقع تھے۔ جمیل کو معلوم تھا کہ آج کل کوئی میچ نہیں ہو رہا اور شوقیہ کھیلنے والے بھی کے جا چکے ہوں

گے چنانچہ گارڈن روڈ کا گیٹ اس وقت رومانی ملاقاتوں کے لیے بہترین "لواسپاٹ" تھا۔

اکبر اس طرف گیا تو جمیل ایک شریر مسکراہٹ کے ساتھ دوبارہ ہال میں داخل ہوا "کہو دوست!" اس نے شاہد سے کہا "کرسی خالی ہو گئی نا۔"

"کیا چکر چلا کر آئے ہو؟" شاہد نے پوچھا "میں نے ہیلن اور اکبر دونوں کو آگے پیچھے باہر جاتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"اپنا تو کام ہی چکر چلانا ہے" جمیل نے شاہد کا بازو پکڑتے ہوئے کہا "آؤ چلیں۔"

دونوں اس میز کی طرف بڑھے جہاں منیر، رشید اور ایوب بیٹھے ہوئے تھے۔

جمیل نے اس کرسی پر ہاتھ رکھا جس پر کچھ دیر پہلے اکبر بیٹھا تھا۔

"یہ اکبر صاحب کی جگہ ہے" رشید بولا۔

"جسے وہ عادتا میرے لیے خالی کر گئے ہیں" جمیل نے کہا "جنرل سیکریٹری کے الیکشن کے بعد سے بے چارہ میرا بڑا خیال کرنے لگا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے جمیل نے لڑکیوں والی میز کی طرف دیکھا۔ ہر میز کے لیے چار کرسیاں فراہم کی گئی تھیں چنانچہ اس نے ایک قدم آگے بڑھا کر کمال بے تکلفی سے شاہد کے لیے وہ کرسی گھسیٹ لی جس پر پہلے ہیلن بیٹھی تھی۔

"اے مسٹر!" ایک لڑکی نے احتجاج کیا "یہ کرسی خالی نہیں ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے اس پر کوئی بیٹھا ہوا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کون۔"

"ہماری ایک سہیلی۔"

"آپ کا اشارہ اس مکھی کی طرف تو نہیں" جمیل نے غور سے کرسی کی طرف دیکھا۔ "کیونکہ فی الحال تو مجھے کرسی پر اس مکھی کے علاوہ اور کوئی بیٹھا ہوا نظر نہیں آتا۔"

"ہماری سہیلی باہر گئی ہے۔ ابھی آتی ہوگی" لڑکی کچھ گڑبڑا کر بولی۔

"کوئی بات نہیں میں بھی یہ کرسی اپنے ایک دوست کے لیے لے رہا ہوں۔ آپ کی سہیلی آجائے گی تو میرا دوست یہ کرسی واپس کر دے گا۔" جمیل نے جواب دیا۔

"رہنے دو نرگس" فیروزی ساری والی نے کہا "آج کل کے نوجوان منہ لگانے کے قابل نہیں ہوتے۔"

"منہ لگانے سے پہلے آپ یہ بات کیسے کہہ سکتی ہیں؟" جمیل نے کہا۔

"شٹ اپ!" فیروزی ساری والی بگڑ کر بولی۔

"ماشاءاللہ۔ انگریزی پڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں" جمیل نے جواب دیا۔

لڑکی نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

"بیٹھو دوست!" جمیل نے شاہد سے کہا اور خود بھی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے خطرہ ہے کہ کسی دن تمہاری دوستی میں جوتے نہ کھانا پڑیں" شاہد نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جوتوں کا رنگ اگر فیروزی ہو تو واللہ مجھے کوئی ملال نہ ہو گا" جمیل ہنستے ہوئے بولا اور ویٹر کو اشارہ کیا۔

"کیا لاؤں جناب!" ویٹر نے قریب آ کر میز صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں بھائیو! چائے چلے گی یا کافی؟" جمیل نے منیر کی طرف دیکھا۔

"شکریہ ہم لوگ پی چکے ہیں" منیر نے جواب دیا۔

"کمال ہے" جمیل نے حیرت ظاہر کی "آج میں پہلی مرتبہ چچھوں سے تکلف کا اظہار سن رہا ہوں۔"

"جمیل صاحب!" رشید تیزی سے بولا "آپ جنرل سیکریٹری کا رعب یہاں کلب میں مت دکھایئے۔"

"اچھا منے!" جمیل نے چمکارا "اگر تمہیں ڈر لگتا ہے تو نہیں دکھائیں گے۔"

رشید تاؤ میں آ کر کرسی پیچھے سرکاتا ہوا کھڑا ہو گیا مگر ٹھیک اسی وقت ہال کے دروازے پر شور سنائی دیا اور کلب کا چوکیدار خان 'اکبر کی گردن پکڑے ہوئے اندر داخل ہوا۔ ہیلن سرخ سرخ آگ بگولا انگریزی میں گالیاں دیتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ دو چار آدمی اور ساتھ تھے وہ سب منیجر کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

"ارے یہ تو اکبر بھائی معلوم ہوتے ہیں۔۔۔ وہی ہیں" جمیل نے بڑے وثوق سے کہا

"جلدی سے بھاگئے ورنہ وہ لڑکی جان محمد باکسر کی محبوبہ ہے۔ آپ سب کی چٹنی بنوا دے گی۔"

جان محمد کو سب ہی جانتے تھے۔ ایوب' رشید' منیر تو ایک دم دروازے کی طرف لپکے۔ لڑکیاں بھی یہ منظر دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"چلو تو فوزیہ!" نرگس نے فیروزی ساری والی لڑکی کو مخاطب کیا "دیکھیں تو سہی' کیا معاملہ ہے؟"

"معاملہ جو کچھ ہو گا وہ میں جانتی ہوں" فوزیہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "میں اسی لیے ہیلن جیسی لڑکی کو ساتھ لانے سے منع کر رہی تھی۔"

"میں تو نہیں لا رہی تھی مگر یہ ستارہ۔" نرگس نے تیسری لڑکی کی طرف اشارہ کیا "آج کل اس سے انگریزی ڈانس سیکھ رہی ہے۔ کہنے لگی اگر ہیلن کو معلوم ہو گیا کہ میں نے تم لوگوں کو کلب میں دعوت دی تھی اور اسے نہیں بلایا تو برا مان جائے گی۔"

"تو پھر تم اور ستارہ ہی جا کر دیکھ آؤ" فوزیہ نے کہا "میں تو اب گھر جا رہی ہوں۔"

"ارے ابھی سے؟" ستارہ نے کہا "پکچر نہیں چلو گی؟"

"نہ بھئی' میری امی ذرا پرانے خیال کی ہیں۔ انہوں نے کلب آنے کی اجازت ہی بڑی مشکل سے دی تھی" فوزیہ نے جواب دیا "اگر یہ ہنگامہ نہ ہوتا تو پندرہ بیس منٹ اور ٹھہرتی مگر اب تو جانے ہی دو۔"

"اچھی بات ہے" نرگس نے کہا "کل شام کو تو گھر پر ہی ملو گی نا۔"

"ہاں اگر شاپنگ کا پروگرام نہیں بن گیا تو ضرور ملوں گی" فوزیہ نے جواب دیا۔

"آپ نے بتایا نہیں صاحب کیا لاؤں؟" ویٹر' جمیل سے پوچھ رہا تھا۔

"تمہارے یہاں فیروزی چائے تو ہو گی نہیں" جمیل نے کچھ بلند آواز میں پوچھا۔

"کون سی چائے؟" ویٹر نے پلکیں جھپکائیں۔

"چلو رہنے دو' اب کل آ کر پئیں گے" جمیل کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ فوزیہ دروازے تک پہنچ گئی تھی۔

"آؤ صاحب زادے!" جمیل نے شاہد کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا "جماعت کھڑی ہو چکی

ہے۔"

"اب کہاں کا ارادہ ہے" شاہد نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"جو نیت امام کی وہ ہماری" جمیل قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔

"گویا تعاقب کیا جائے گا؟"

"گلے۔ گلے تک" جمیل نے گردن پر ہاتھ رکھا۔

"تھوڑا سا ہاتھ اوپر اور لے جاؤ بالکل صحیح مقام تک پہنچ جاؤ گے" شاہد نے منہ بنا کر کہا۔

"یہ سرا اکبر کا نہیں جناب' جمیل بی اے پلکڈ کا ہے۔"

"جب سینڈل پڑنے لگتے ہیں تو نام بتانے کی مہلت نہیں ملتی۔"

فوزیہ کلب کے مین گیٹ پر پہنچ کر جس انداز سے کھڑی تھی اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی ٹیکسی میں جانے کا ارادہ رکھتی ہے اگرچہ اس وقت بھی گیٹ کے دونوں طرف تین چار خالی ٹیکسیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ جمیل نے اسے رکتے دیکھ کر اپنی رفتار آہستہ کر دی۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ہماری دوستی ختم ہونے والی ہے" شاہد نے کہا۔

"وہ کس خوشی میں؟" جمیل نے جیب سے سگریٹ کیس نکالتے ہوئے پوچھا۔ نگاہیں برابر فوزیہ پر جمی ہوئی تھیں۔

"اب تم مستقل لڑکیوں کے پیچھے وقت برباد کرنے لگے ہو۔" شاہد نے جواب دیا "میں اس لیے آتا ہوں کہ کچھ دیر باتیں رہیں۔ کوئی دلچسپ پروگرام بنے' کوئی تفریح ہو۔ یہ آوارہ گردی تو اکیلے بھی کر سکتے ہو۔"

"شش" جمیل نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا "بس آ گئی ہے۔"

کلب کے گیٹ کے قریب بس اسٹاپ بھی بنا ہوا تھا اور ایک بس اسی وقت آ کر رکی تھی۔ فوزیہ نے خواتین کے دروازے کی طرف قدم بڑھایا۔ جمیل' شاہد کو گھسیٹتا ہوا لے چلا۔

بس تقریباً خالی تھی۔ جمیل بالکل اگلی سیٹوں پر جا کر بیٹھ گیا۔ ایک لمحہ ٹھہر کر بس دوبارہ

چل دی۔

"ٹکٹ؟" کنڈیکٹر نے قریب آ کر جمیل کی طرف ہاتھ پھیلایا۔

"دو ٹکٹ فیروز پور کے" جمیل نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔

"یہ بس فیروز پور نہیں جا رہی ہے" کنڈیکٹر نے غور سے جمیل کی طرف دیکھا۔

"اچھا!" جمیل نے جیسے بڑی مایوسی سے کہا "تو پھر جہاں جا رہی ہے' وہاں کے دو ٹکٹ دے دو۔"

"بابو جی! مذاق مت کرو' مجھے ابھی لیڈیز میں بھی ٹکٹ دینا ہے۔" کنڈیکٹر بولا۔

جمیل نے کنڈیکٹر کے کندھے سے لٹکے ہوئے چرمی تھیلے کی طرف دیکھا۔ جس میں مختلف رنگوں کے ٹکٹ ایک قطار میں لگے ہوئے تھے۔

"یہ فیروزی ٹکٹ کہاں تک چلے گا" جمیل نے ایک گڈی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"صدر بازار تک" کنڈیکٹر نے جواب دیا "اور یہ فیروزی نہیں ہرا ہے۔"

"چلو تو پھر صدر بازار کے ہی تین ٹکٹیں دے دو" جمیل نے کہا۔

"تین! ابھی تو آپ نے دو ٹکٹ مانگے تھے۔"

"اگر میں ایک ٹکٹ فالتو خرید لوں تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟"

"کچھ نہیں" کنڈیکٹر مسکرایا "میری طرف سے آپ پوری بس کے ٹکٹ خرید سکتے ہیں۔"

اس نے تین ٹکٹ پھاڑ کر جمیل کے ہاتھ میں دے دیئے اور جمیل سے پانچ روپیہ کا نوٹ لے کر بقیہ ریزگاری نکالنے لگا۔

بس مختلف اسٹاپوں پر رکتی ہوئی اپنی منزل کی طرف چلی جا رہی تھی۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ فوزیہ نے بھی صدر بازار کا ٹکٹ لیا تھا۔ پچھلی نشست پر دو حضرات موجودہ ملکی فلموں کے حسن و قبح پر بحث کر رہے تھے کہ ہمارے فلم ساز اور ہدایت کار گھسی پٹی چربہ فلمیں بنا رہے ہیں اور ان کے پاس بس ایک ہی موضوع ہے محبت کا۔ تقریباً ہر فلم کی کہانی ایک جیسی ہوتی ہے۔ وہی لڑکا لڑکی' دونوں کی اتفاقیہ ملاقات۔ پہلی نگاہ میں دونوں کا رومانس' پھر

ایک ولن کی آمد' مار پیٹ' ہجر و وصال اور آخر میں دونوں کی شادی۔"

"آپ نے کہیں دیکھا ہے کہ ہیروئن اگر بس میں سفر کر رہی ہے تو ہیرو صاحب بھی ضرور اسی بس میں موجود ہوں گے" وہ صاحب جوش میں اپنے ساتھی سے بولے "پھر ہیرو کا پاؤں ہیروئن کے پیر کو کچل دے گا اور ....."

"معاف فرمایئے گا" جمیل نے گھومتے ہوئے کہا "بندے کا ذاتی تجربہ ہے کہ ہیرو' ہیروئن عموماً ایک ہی بس میں سوار ہوتے ہیں اور ان میں پہلی نگاہ میں محبت بھی ہو جاتی ہے۔"

ان صاحب نے تیزی سے پوچھا "اور اس محبت کے نتیجے میں ان کی شادی بھی ہو جاتی ہے؟"

"جی ہاں' ففٹی پرسنٹ تو ضرور ہو جاتی ہے" جمیل نے جواب دیا "بقیہ ففٹی کے لیے معلوم کرنا پڑے گا۔"

"مگر میں کہتا ہوں جناب' کیا ہمارے فلمسازوں کے پاس محبت کے علاوہ کوئی موضوع نہیں رہ گیا ہے جس پر فلمیں بنائی جائیں۔" دوسرے صاحب چمک کر بولے۔

"یہی سوال میں نے ایک فلمساز سے کیا تھا" جمیل نے بتایا "پہلے تو انہوں نے بڑی حیرت سے میری طرف دیکھا۔ خیال انگیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بڑبڑائے "کوئی اور موضوع۔" چند لمحے سوچتے رہے' ایک دم ان کی آنکھوں میں چمک آگئی' چہرے پر سرخی دوڑ گئی اور اپنی سیٹ سے اچھلتے ہوئے انہوں نے پر جوش آواز میں کہا "میں سمجھ گیا آپ کا مطلب ہے کوئی اور محبت۔""

"جی ہاں' بالکل یہی ذہنیت ہے آج کل ہمارے پروڈیوسروں کی' اسی کا نتیجہ ہے کہ فلمیں پے در پے فلاپ ہو رہی ہیں۔"

"جیسے اپنے فیروز بھیا کی "السلام علیکم؟" جمیل نے جلدی سے کہا۔

"ارے صاحب' یہی کیا اور نہ جانے کتنی فلمیں ہیں" پہلے صاحب نے جواب دیا "میں کہتا ہوں کہ اگر ان لوگوں کو ہماری موجودہ زندگی میں کوئی موضوع نہیں ملتا تو پرانی تاریخ پر ہی ایک نظر ڈال لیں۔ ایسی ولولہ انگیز داستانیں مل سکتی ہیں کہ جواب نہیں اور

کچھ نہ سہی تو بڑے بڑے مسلمان بادشاہوں کی زندگی ہی کے واقعات فلمائے جا سکتے ہیں مثلاً صلاح الدین ایوبی۔"

"یا جیسے فیروز شاہ تغلق یا پھر دکن کے بہمنی خاندان کا فیروز شاہ بہمنی۔" جمیل نے لقمہ دیا۔

ممکن تھا گفتگو ابھی اور آگے بڑھتی مگر اسی وقت کنڈیکٹر نے صدر بازار کی آواز لگائی۔ جمیل نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ فوزیہ ساری سنبھالتے ہوئے اتر رہی تھی۔ جمیل نے شاہد کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی چڑھنے والے لوگوں سے دھینگا مشتی کرتا ہوا بس سے اتر آیا۔ مگر اسے تعجب ہوا کہ فوزیہ کسی طرف جانے کے بجائے وہیں اسٹاپ پر ایک جانب کھڑی ہو گئی۔ صدر بازار کا اسٹاپ شہر کی تقریباً تمام بسوں کا جنکشن تھا۔ اس کے یوں اتر کر انتظار کرنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ یہاں سے کسی اور بس میں سوار ہونا چاہتی ہے۔ جمیل اور شاہد بھی ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

"یار' میں نے آج سے پہلے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا کہ فیروز کا تعلق ہماری قدیم اور جدید زندگی سے کتنا گہرا ہے" جمیل نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے اس وقت کیا بجا ہے؟" اچانک شاہد نے پوچھا۔

"بڑا فیروزی ٹائم ہے دوست" جمیل نے گھڑی دیکھی "آٹھ بجنے میں دس منٹ ہیں۔"

"اور یہ صدر بازار کا بس اسٹاپ ہے۔"

"تمہارا مطلب کیا ہے؟" جمیل چونکا۔

اتنے میں سوسائٹی کی ایک بس آکر رکی۔ فوزیہ اس کی طرف بڑھنے لگی۔ جمیل نے شاہد کے بازو میں ہاتھ ڈالا اور بس کی جانب ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کا کان پکڑ لیا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو برخوردار!" احمد علی صاحب کی آواز آئی۔ جمیل نے پلٹ کر باپ کی طرف دیکھا اور پھر شاہد کی طرف جو بڑے پراسرار انداز میں مسکرا رہا تھا۔

"آپ ہی کے پاس آیا تھا ڈیڈی!" جمیل کان چھڑاتے ہوئے بولا۔ اسے بعد از وقت

یاد آیا کہ احمد علی صاحب ساڑھے سات بجے دکان بند کر دیتے ہیں۔

"گویا تمہیں نتیجے کا اخبار مل گیا؟" احمد علی صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ "کیا رہا؟"

"وہی جو ہر سال رہتا ہے" شاہد نے آہستہ سے کہا تھا مگر احمد علی صاحب نے سن لیا۔

"تو گویا پاس ہو گئے۔"

"آپ ہمیشہ سے کہتے ہیں ڈیڈی کہ مجھے آپ کے نفع و نقصان کا کوئی احساس نہیں ہوتا" جمیل نے کہا۔

"اور بالکل درست کہتا ہوں" احمد علی صاحب نے گردن ہلائی۔

"اس مرتبہ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں پاس ہو گیا تو آپ مجھے ایک نئی کار خرید کر دیں گے۔"

"ہاں کہا تو تھا" بڑے فکر مند لہجے میں جواب ملا۔

"تو ڈیڈی آپ کو سن کر خوشی ہو گی کہ میں نے آپ کے ہزاروں روپے خرچ ہونے سے بچا لیے" جمیل نے بڑے فخریہ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" احمد علی صاحب نے غور سے جمیل کی طرف دیکھا "نالائق، تو کہیں بی اے میں فیل تو نہیں ہو گیا ہے؟"

سوسائٹی والی بس ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ جمیل نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"ہاں ڈیڈی!" اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا "کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

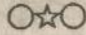
"مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ سال بھر تک جس لڑکے نے کتابوں کو ہاتھ نہ لگایا ہو وہ امتحان میں کیسے پاس ہو سکتا ہے۔"

"خیر، آپ یہ تو نہیں کہہ سکتے" جمیل نے بڑی معصومیت سے کہا "آپ کے حکم کے مطابق ہر ہفتے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے مجھے لامحالہ سب کتابوں کو ہاتھ لگانا پڑتا تھا رہا فیل ہونا تو یہ قسمت کی بات ہے، آخر اب تک ہر سال پاس ہوتا ہی رہا تھا۔"

"جی ہاں" شاہد نے بھی کہا "خدا نے چاہا تو اگلے سال ضرور پاس ہو جائیں گے۔"

"نہیں جی" احمد علی صاحب نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا "بس ہو چکی پڑھائی، کل سے

دکان پر بیٹھو۔"



جمیل نے ہر چند شور مچایا، کان پکڑ کر وعدے بھی کیے کہ بس ایک سال اور اسے پڑھنے کا موقع دیا جائے، وہ ضرور پاس ہو جائے گا۔ اس کی ماں نے بھی سفارش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی مگر احمد علی صاحب کے پاس ہر کوشش کے جواب میں وہی فقرے تھے جنہیں وہ بڑی مستقل مزاجی سے دہراتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جمیل یا دکان پر بیٹھے یا ملازمت کرے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ وہ اگر پڑھائی بھی جاری رکھنا چاہے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ بہرحال اب وہ اس کی پڑھائی کے سلسلے میں ایک پیسہ بھی خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جمیل کو دوپہر کے کھانے کی بعد چاروناچار دکان پر جانا پڑا۔

دکان پر گھنٹے بھر تک احمد علی صاحب مختلف کپڑوں کے بھاؤ بتاتے رہے۔ گاہکوں سے گفتگو کس طرح کی جاتی ہے، کس طرح ان کی حیثیت کا اندازہ لگا کر کپڑا دکھایا جاتا ہے۔ عورتوں کو کم سے کم دگنے نرخ بتانا کیوں ضروری ہوتے ہیں۔ کپڑا ناپنے کا طریقہ کیا ہے؟ محض ناپنے سے فی گز ایک انچ کے حساب سے تھان پر ایک گز کی کفایت کیسے نکالی جا سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ جمیل بڑی فرمانبرداری سے سر ہلا ہلا کر یہ لیکچر سنتا رہا۔ گاہکوں کو دکھانے کے لیے دوڑ دوڑ کر تھان بھی لاتا رہا اور بعد میں پھیلے ہوئے تھانوں کو تہ کر کے بھی رکھتا رہا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر احمد علی صاحب وقت سے کچھ پہلے ہی مغرب کی نماز پڑھنے مسجد چلے گئے۔

جمیل نے اطمینان سے باپ کی گدی پر بیٹھ کر اتنی دیر میں پہلا سگریٹ نکال کا سلگایا۔

اتفاق سے اسی وقت شاہد بھی آگیا۔

"آج ذرا کچھ کام کے آدمی معلوم ہو رہے ہو" اس نے مسکرا کر اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا دکھاؤں صاحب، پاجاموں کے لیے سولہ ہزار کا لٹھا؟ قمیصوں کے لیے خادم جی کی ٹوبائی ٹوپاپلین یا پھر سوٹ بنوانے کا ارادہ ہو تو ڈائریکٹ جاپان سے منگوایا ہوا سوٹنگ۔"

اور اس سے پہلے کہ شاہد کوئی جواب دیتا۔ جمیل ایک سیلزمین کی طرف گھوما "شوکت"
اس نے آواز دی "دیکھتے نہیں ہو کہ ڈپٹی کمشنر صاحب کے بڑے صاحب زادے ہماری
دکان پر تشریف لائے ہیں۔ ذرا لپک کر ایک اسپیشل چائے تو بول دو۔"

"بھائی، میں کپڑا خریدنے کے ارادے سے نہیں آیا" شاہد نے جلدی سے کہا۔

"اجی آپ کے ارادے سے کیا ہوتا ہے" جمیل نے آنکھ ماری "ہم جو یہاں کپڑا بیچنے
کے ارادے سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ آئندہ نسلوں تک کے لیے آپ کو نہ خریدوا دیا تو کہیئے گا
کہ پچپن سال تک کپڑا نہیں بیچا تھا بلکہ جھک ماری تھی" پھر ذرا جھک کر آہستہ سے بولا۔

"یار، تمہارا کیا جاتا ہے۔ اسی بہانے ایک پیالی میں بھی پی لوں گا۔ دوپہر سے ڈیڈی کا
لیکچر سنتے سنتے دماغ بالکل بھس ہو گیا ہے۔ بس خاموش بیٹھے کپڑا دیکھتے رہو۔"

شوکت چائے لے کر آیا۔ جمیل نے سامنے پھیلے ہوئے کپڑے کی خوبیوں پر تقریر
کرتے ہوئے چائے بنائی اور اپنی پیالی اس طرح اٹھا کر پینے لگا جیسے بغیر سحری کے رکھا روزہ
افطار کر رہا ہو۔ چائے پیتے پیتے اچانک شاہد کی نظر بازار کی طرف اٹھ گئی۔

"سوسائٹی" اس نے آہستہ سے جمیل کے کہنی مارتے ہوئے کہا۔

"جی!" جمیل چونکا "فی الحال اس نام کا کوئی کپڑا ابھی تک ایجاد نہیں ہوا ہے" مگر اسی
وقت اس نے بھی فوزیہ کو اپنی دکان کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ لیا۔

"اوہ، آپ کا مطلب ہے ہائی سوسائٹی یعنی اونچا طبقہ۔ جی ہاں، شہر کے تمام بڑے
بڑے لوگ ہماری ہی دکان سے کپڑا خریدتے ہیں۔"

فوزیہ نے آج چاکلیٹی رنگ کی ساری پہنی ہوئی تھی اور کوئی شک نہیں کہ یہ رنگ بھی
اس پر اتنا ہی کھل رہا تھا جتنا فیروزی۔ وہ کل کی طرح آج بھی تنہا ہی تھی اور غالباً دکانوں پر
بورڈ پڑھتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ احمد علی صاحب نے دکان پر "کمخواب پیلس" کا بورڈ
لگوا رکھا تھا۔ فوزیہ نے بورڈ پڑھا۔ وہ اس وقت تک جمیل کو نہیں دیکھ سکی تھی جب تک
کہ دکان میں داخل نہ ہو گئی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے قدم رکے۔ انداز سے ہچکچاہٹ کا
اظہار ہوا جیسے سوچ رہی ہو کہ واپس چلی جائے یا اب آ ہی گئی ہے تو باقی دو چار قدم کا فاصلہ
بھی طے کر ڈالے۔ جمیل نے جلدی سے چائے کی ٹرے اٹھا کر ایک طرف رکھ دی۔

"تشریف لائیے" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ ہی کی دکان ہے۔ یہاں سے
اچھا اور سستا کپڑا آپ کو پوری مارکیٹ میں کہیں نہیں مل سکتا۔"

فوزیہ نے آخر کار آگے بڑھنے ہی کا فیصلہ کیا۔ خاموشی سے سامنے پڑے ہوئے
اسٹول پر بیٹھ گئی۔

"فرمایئے، کیا پیش کروں؟" جمیل نے پوچھا "آنکھ کا نشہ، دل کی پیاس، تیری میری
مرضی یا پھر اے عشق کہیں لے چل۔"

"یہ آخری کپڑا غالباً صرف آپ کی دکان پر ملتا ہو گا" فوزیہ نے بڑے تیکھے انداز میں
پوچھا۔

"جی ہاں اور وہ بھی مغرب کی نماز سے پہلے پہلے" جمیل نے بڑی سادگی سے جواب
دیا۔

"بہت خوب مگر مجھے فی الحال بہت اچھے قسم کی گلابی رنگ کی جارجٹ کی ضرورت
ہے۔ آپ کے پاس ہو گی؟"

"کیوں نہیں؟" جمیل نے کہا اور پھر کسی سیلزمین کو آواز دینے کے بجائے خود ہی اٹھ
کر سفید جارجٹ کا ایک تھان نکال لایا۔

"یہ لیجیے" اس نے تھان کھول کر فوزیہ کے سامنے ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں نے گلابی رنگ کہا تھا" فوزیہ بولی۔ جمیل نے کسی قدر حیرت سے پہلے اس کی
طرف اور پھر کپڑے کی طرف دیکھا۔ تھان اٹھا کر روشنی کی طرف لے گیا۔

"اوہ یہ تو واقعی سفید ہے" وہ بڑبڑایا "مجھے پتا نہیں اس میں گلابی رنگ کی جھلک کیوں
نظر آئی؟"

وہ فوزیہ کی طرف گھوما۔

"معاف کیجیے گا، گلابی جارجٹ ابھی پیش کرتا ہوں" اس نے کہا اور جلدی سے اٹھ کر
دوسرا تھان الماری سے نکال کر فوزیہ کے سامنے کھول دیا۔

فوزیہ نے کپڑا ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ جارجٹ واقعی بہترین قسم کی تھی، اب تک اس
نے جتنی دکانوں پر دیکھا تھا یہ جارجٹ اسے ان سب سے اچھی محسوس ہوئی۔ رنگ بھی

اس کا بہت ہلکا اور پیارا گلابی تھا۔

"کیا گز ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اب آپ سے مول تول کیا کرنا ہے" جمیل نے کہا "آپ تو یہ فرمایئے کتنا کپڑا درکار ہے؟"

"آپ دام کیوں نہیں بتاتے؟"

"اُفوہ، عرض کیا نا بالکل واجبی دام ہوں گے۔"

"مگر معلوم بھی تو ہو" فوزیہ نے اصرار کیا۔ جمیل نے ایک نظر اپنے سیلز مینوں پر ڈال۔

"چلئے آپ کو پانچ روپے گز مل جائے گا۔"

"کیا!" حیرت سے فوزیہ نے جمیل کی طرف دیکھا۔ بالکل گھٹیا قسم کی جارجٹ بھی چالیس پچاس روپے سے کم نہیں آتی تھی۔

"کیا میں نے کچھ زیادہ دام بتا دیے" جمیل نے جلدی سے کہا "آپ کچھ کم دے دیجئے گا۔"

"آپ مذاق کر رہے ہیں، یہ جارجٹ میرے خیال سے پچاس روپے سے کم نہیں ہونا چاہیے" فوزیہ نے کچھ غصے سے کہا۔

"اُفوہ۔ تو دوسرے دکان دار اس طرح گاہکوں کو لوٹ رہے ہیں" جمیل نے آنکھیں پھاڑیں "حد ہو گئی نفع کمانے کی، بہرحال میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ ہمارے یہاں واجبی نرخ پر کپڑا ملتا ہے۔ اب تو آپ کو یقین آ گیا ہو گا۔"

"تو کیا سچ مچ یہ جارجٹ آپ کو پانچ روپے گز پڑتی ہے؟" فوزیہ نے پوچھا۔

"اب آپ کو آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے؟ یہ بتایئے کتنے گز دے دوں؟"

"اس حساب سے تو آپ پورا تھان ہی دے دیں۔" فوزیہ نے پرس کھولا۔

جمیل نے کپڑا ناپنا شروع کیا۔ اس تھان پر سترہ گز جارجٹ نکلی۔

"یہ لیجئے سترہ گز ہے" اس نے تھان لپیٹ کر فوزیہ کے سامنے رکھ دیا۔

"کتنے روپے ہوئے؟" فوزیہ نے پرس سے ایک سو روپے کا نوٹ نکالتے ہوئے پوچھا۔

"آپ ہی لگا لیجئے حساب" جمیل نے کہا۔

"آپ کو سترہ کا پہاڑہ نہیں آتا کیا؟" فوزیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"محترمہ چودہ برس کے بعد آج آزادی کا پہلا سانس لیا ہے کم سے کم آج تو پہاڑوں کی یاد نہ دلایئے۔"

"پچاسی روپے ہوئے" شاہد نے بتایا۔

جمیل نے سو روپے کا نوٹ لے کر صندوقچی میں ڈالا اور پندرہ روپے نکال کر فوزیہ کو واپس کر دیئے۔

"امید ہے آپ آئندہ بھی ہماری دکان سے کپڑا خریدنے تشریف لاتی رہیں گی" اس نے کہا۔

"اگر آپ کی دکان پر دوسرے کپڑے بھی اسی بھاؤ سے ملتے ہیں تو میں ہی کیا کوئی بھی ایک مرتبہ یہاں خریدنے کے بعد کسی اور دکان پر جانا پسند نہیں کرے گا" فوزیہ نے اٹھتے ہوئے کہا اور دکان سے باہر نکل گئی۔

"یار! میں تو اس کھونٹے سے باندھ دیا گیا ہوں" جمیل نے سرگوشی میں کہا "ذرا تم اس کا پیچھا کر کے گھر کا پتا تو معلوم کر آؤ۔"

"معاف کیجئے، میں دوستوں کی خاطر بھی اس اخلاقی کمزوری میں مبتلا ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں" شاہد نے جواب دیا۔

"اچھا دوست، کبھی تم بھی کسی کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گے تب پوچھیں گے۔"

"اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا" شاہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا استاد اسی بات پر کوئی تازہ غزل ہو جائے۔"

"جی ہاں دوران غزل چچا جان تشریف لے آئے تو وہ داد ملے گی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔"

"ارے تمہیں نہیں معلوم ڈیڈی تو خود شعر و شاعری پر جان دیتے ہیں" جمیل نے کہا

تھیں۔ لڑکی سیلز مین کے ساتھ ساتھ کچھ آگے بڑھ گئی۔ سیلز مین اسے مختلف رنگوں اور ڈیزائنوں کے لیڈیز ہینڈ بیگ دکھانے لگا۔

جمیل نے کاؤنٹر پر پہنچ کر ایک نظر لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر کاؤنٹر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "میں نے کہا جناب، کوئی ہمارا پوچھنے والا بھی ہے یا نہیں؟"

"آپ کو کیا چاہیے؟" سیلز مین نے وہیں سے پکار کر کہا۔ اتفاق سے اس وقت وہ دکان میں اکیلا ہی تھا۔

"کوئی بہترین قسم کا لیڈیز ہینڈ بیگ" جمیل نے جواب دیا۔

"تو پھر اسی طرف تشریف لے آیئے" سیلز مین نے کہا۔ جمیل پوری بے تکلفی سے لڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔

"یہ دیکھئے" سیلز مین نے کچھ بیگ جمیل کے سامنے ڈال دیئے۔

"یہ کتنے کا ہے؟" لڑکی نے سیاہ قسم کا ایک بیگ اٹھا کر پوچھا۔

"صرف دو سو روپے کا۔"

"اور یہ؟"

"اس کی قیمت آپ کے لیے ڈھائی سو روپے ہوگی۔"

"تو پھر یہی دے دیجئے مگر دام آپ نے زیادہ بتائے ہیں۔"

"اس قیمت میں یہ چیز پوری مارکیٹ میں مل جائے تو دام واپس" سیلز مین نے کہا۔

"یہ لیجئے" لڑکی نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چھوٹے پرس میں سے روپے نکالتے ہوئے کہا۔

"پیک کر دوں یا یونہی لے جائیں گی؟"

"پیک کرنے کی ضرورت نہیں ہے" لڑکی نے بیگ میں پرس رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں صاحب، آپ کہئے؟" وہ جمیل کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ کو بھی کوئی پسند آیا کہ نہیں؟"

"ہاں" جمیل نے ہاں کو کچھ کھینچ کر کہا "کوئی پسند تو آگیا ہے۔"

اس نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"جی!" سیلز مین نے جمیل کو گھور کر دیکھا۔

"میرا مطلب ہے مجھے بھی ایک ایسا ہی بیگ دے دیجئے" جمیل نے اطمینان سے کہا۔

لڑکی جو اس کے اشارے پر گھبرا کر رک گئی تھی۔ جلدی سے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔

"یہ لیجئے" سیلز مین نے ایک ویسا ہی سیاہ رنگ کا بیگ جمیل کے سامنے رکھ دیا۔

جمیل نے سو سو کے دو نوٹ نکال کر کاؤنٹر پر رکھے اور بیگ اٹھا کر دروازے کی طرف لپکا۔

"میں نے کہا جناب!" سیلز مین نے پکارا "یہ تو صرف دو سو روپے ہیں۔"

"آہستہ بولو میرے بھائی" جمیل نے پلٹ کر جواب دیا۔ "بیگم نے سن لیا تو وہ پچاس روپے بھی واپس کرنا پڑیں گے۔"

"بیگم؟" سیلز مین کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"جی۔ اور آپ کیا سمجھے تھے؟" جمیل نے کہا اور لپک کر دروازے سے باہر نکل گیا۔

لڑکی سڑک کے دوسری جانب فٹ پاتھ پر اردو بازار کی طرف جا رہی تھی۔ جمیل نے اسی فٹ پاتھ پر اپنا سفر جاری رکھا۔ تقریباً پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد لڑکی نے گھوم کر دیکھا۔ بظاہر جمیل کو اپنے تعاقب میں نہ پا کر اطمینان کی سانس لی اور قدرے سکون سے چلنے لگی۔ جمیل آپ ہی آپ مسکرایا۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ خوب صورت لڑکیاں خود ہی اس کی راہ میں آجاتی تھیں۔ وہ تو اپنی امی سے مختلف محکموں اور تجارتی فرموں میں ملازمت کی درخواستیں بھیجنے کے لیے ایک رم کاغذ پچیس لفافے اور ہر سرٹیفکیٹ کی پچیس پچیس فوٹو اسٹیٹ کرانے کے لیے دو سو روپے لے کر گھر سے نکلا تھا۔ احمد علی صاحب نے رات ہی کو اپنا الٹی میٹم بیگم صاحبہ کے سامنے بھی دہرا دیا تھا اور صبح دکان جاتے جاتے اس کا اعادہ کرتے گئے تھے چنانچہ جمیل کو دو سو روپے ملنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ بس کا انتخاب کرنے میں اس کے ارادے کو ہرگز کوئی دخل نہیں تھا۔ اردو بازار جانے والی جو پہلی بس اس کے سامنے آئی وہ اس میں بیٹھ گیا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ یہ لڑکی پتا نہیں کہاں سے اسی بس میں بیٹھی ہوئی آرہی تھی۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ جمیل کو اگلی

سیٹوں پر جگہ تلاش کرنا پڑی اور جب وہ لڑکی اردو بازار سے ایک اسٹاپ پہلے ریگل مارکیٹ پر اتری تو اسے بھی چاروناچار اسی اسٹاپ پر اترنا پڑا۔ پھر اسی مجبوری کے تحت وہ تعاقب بھی شروع ہو گیا جس سے بچنے کے لیے لڑکی کو جنرل اسٹور میں گھسنا پڑا تھا حالانکہ وہ ریگل کے اسٹاپ پر محض اپنا ٹرانزسٹر مرمت کے لیے دینے اتری تھی۔

جمیل نے دور ہی سے لڑکی کو جمالستان پبلشرز کی دکان میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا اور خود بھی اسی طرف چل دیا' وہ اور کرتا بھی کیا؟ اس نے تو لڑکی سے نہیں کہا تھا کہ وہ اس کے دوست کے باپ کی دکان میں گھس جائے۔ جمیل نے دکان میں قدم رکھا تو مشرف' اس کا دوست چیک بک سے لڑکی کو ایک چیک پھاڑ کر دے رہا تھا۔

"یہ لیجیے" اس نے مشرف کو کہتے ہوئے سنا "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو آنے کی زحمت کرنا پڑی مگر جیسا کہ آپ دیکھ رہی ہیں چیک لکھا رکھا تھا اور میرا ارادہ آج شام کو پروفیسر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا تھا۔"

"کوئی بات نہیں" لڑکی نے چیک لے کر اپنے بیگ میں رکھتے ہوئے کہا "میں ذرا کام سے ریگل مارکیٹ آئی تھی سوچا کہ آپ سے بھی معلوم کرتی چلوں۔"

"یہاں دستخط کر دیجیے" مشرف نے ایک رجسٹر نما کاپی لڑکی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور ٹھیک اسی لمحے اس کی نگاہ جمیل پر پڑی۔

"اوہ ہیلو!" وہ پرتپاک انداز میں اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "بھئی کمال کے آدمی ہو اتنی مرتبہ تمہارے گھر فون کر چکا ہوں مگر یہی جواب ملتا ہے کہ صاحب زادے تو کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔"

لڑکی نے چونک کر جمیل کی طرف دیکھا اور اسے پہچان کر اس کے ہاتھوں سے قلم گرتے گرتے بچا۔ جمیل نے مشرف کو زیادہ بڑھنے کا موقع نہیں دیا۔ دو تین لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا وہ خود اس کے قریب پہنچ گیا۔

"کیا بتاؤں مشرف بھائی!" وہ ہاتھ ملاتے ہوئے بولا "بی اے پاس کرنا گویا ایک مصیبت ہو گئی ہے۔ روز کہیں نہ کہیں دعوت میں جانا پڑتا ہے۔"

"مگر اکبر تو کہہ رہا تھا کہ۔۔۔"

"اکبر نے آج تک کبھی سچ بولا ہے" جمیل نے مشرف کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور یہ کہتے ہوئے اس طرح ہاتھ چلایا کہ قریب ہی رکھا ہوا لڑکی کا بیگ نیچے گر پڑا۔ لڑکی دستخط کرنے میں مصروف تھی' اس نے یہ نہیں دیکھا کہ نیچے سے بیگ اٹھا کر واپس رکھتے ہوئے جمیل کی بغل میں دبا ہوا بیگ اس کے بیگ کی جگہ لے چکا ہے اور اس کا بیگ کمال ہوشیاری سے جمیل کی بغل میں جا پہنچا ہے۔

"تو اب میں جا سکتی ہوں؟" اس نے مشرف کو فونٹین پین واپس کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں ضرور" مشرف دوبارہ لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا "پروفیسر صاحب سے میری طرف سے معذرت کر دیجیے گا اور کہئے گا کہ کتاب کا پہلا ایڈیشن ختم ہونے کے قریب ہے اگر ان کی اجازت ہو تو ہم سابقہ شرائط پر دوسرا ایڈیشن چھاپنے کے لیے بھی تیار ہیں۔"

"جی بہت اچھا' میں کہہ دوں گی" لڑکی نے بیگ اٹھایا اور دروازے کی طرف چل دی۔

"کون ہے یہ؟" جمیل نے سرگوشی میں پوچھا۔

"پروفیسر وحید الدین کی صاحب زادی غزالہ خاتون" مشرف نے جواب دیا۔

"یہ پروفیسر وحید الدین صاحب کون ذات شریف ہیں؟"

"تعجب ہے' تم انہیں نہیں جانتے؟" مشرف بولا "ان کی لکھی ہوئی سائنس کی کتاب تو آج کل بی ایس سی کے نصاب میں شامل ہے۔"

"معلومات فراہم کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ اچھا خدا حافظ!" جمیل نے قدم بڑھایا۔

"ارے کہاں چل دیے سنو تو" مشرف نے حیرت سے پکارا۔

"کہنے سننے کا وقت گزر چکا ہے دوست۔"

"وہ میں نے تمہیں اس لیے فون کیا تھا کہ جن لڑکیوں کو تم نے کتابیں دلوائی تھیں ان کے پیسے ابھی تک نہیں آئے ہیں۔" مشرف کاؤنٹر کے دوسری طرف جمیل کے ساتھ چلا آرہا تھا "اور ابا جان کہہ رہے تھے کہ۔۔۔"

"مجھے معلوم ہے مگر تم ان کی باتوں کا خیال مت کیا کرو" جمیل نے ہاتھ ہلا کر کہا "ذرا سوچو تو کہ تمہاری ابھی عمر ہی کیا ہے اور سات آٹھ لڑکیاں تمہاری احسان مند ہو چکی ہیں۔"

بخدا اتنی کم سنی میں تمہارے اباجان اس سے آدھا اسکور بھی نہیں کر سکے ہوں گے۔"

مشرف ابھی اس جملے کا مطلب ہی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جمیل دکان سے باہر جا چکا تھا۔

جمیل نے باہر نکل کر دیکھا۔ غزالہ کافی دور جا چکی تھی۔ اچانک اس نے اسے تاج ریسٹورنٹ کے چوراہے پر بائیں ہاتھ کی طرف گھومتے دیکھا۔ وہ دل ہی دل میں ہنسا۔ یہ لڑکیاں بھی کتنی سادہ لوح ہوتی ہیں۔ وہ محض جمیل کو دھوکہ دینے کے لیے اتنی دور تک گئی تھی جبکہ حقیقتاً اس کا مقصد دوسری طرف گھوم کر ریگل مارکیٹ کے اسٹاپ تک واپس آنے کا تھا۔ جمیل بڑے اطمینان سے سیدھے ہاتھ کی گلی میں گھوم گیا۔

اس کا اندازہ سو فیصدی درست ثابت ہوا۔ گلی پار کر کے وہ روڈ پر آیا تو غزالہ اس سے صرف دس قدم آگے جا رہی تھی اور شاید اسے گمان تک نہیں تھا کہ جس شخص سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس نے اتنا لمبا چکر کاٹا تھا وہ بدستور اس کے تعاقب میں چل رہا ہے مگر غالباً اسے ان نگاہوں کے لمس کا احساس ہو گیا جو اس کے سراپا سے لپٹی ہوئی تھیں۔ غزالہ نے بے اختیار پیچھے گھوم کر دیکھا اور پہلی مرتبہ پریشان ہونے کے ساتھ ہی خوف زدہ بھی ہو گئی۔ اس نے گھبرائی ہوئی ہرنی کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر ایک ٹریفک پولیس کا سپاہی شاید اپنی ڈیوٹی ختم کر کے گھر واپس جا رہا تھا۔ غزالہ تیز تیز قدموں سے اس کی طرف بڑھی۔ جمیل نے اس کا عندیہ بھانپ لیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے قدم رکے۔

"سنیے محترمہ!" اس نے آواز دی۔

مگر غزالہ نے کانسٹیبل کے پاس جا کر ہی دم لیا۔

کانسٹیبل نے حیرت سے اس حسین مداخلت کو سر سے پیر تک دیکھا۔

"وہ شخص بڑی دیر سے میرے پیچھے لگا ہوا ہے" غزالہ نے ہاتھ اٹھا کر جمیل کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا!" کانسٹیبل نے گھور کر جمیل کی طرف دیکھا اور غیر شعوری طور پر اپنی جیب ٹٹولی۔ جیسے یہ بھی کوئی ٹریفک کا کیس تھا جس کا چالان کرنے کے لیے نوٹ بک ضروری تھی۔

مگر پھر فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اتنی دیر میں جمیل بھی قریب پہنچ چکا تھا۔

کانسٹیبل ایک قدم بڑھا کر اس کے سامنے آ گیا۔

"اے مسٹر!" وہ تحکمانہ لہجے میں بولا "تم اس شریف لڑکی کا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟"

"پتا نہیں حسین لڑکیوں کو اپنے متعلق یہ خوش فہمی کیوں ہو جاتی ہے کہ ہر وہ نوجوان جو ان کے پیچھے آ رہا ہے لازمی طور پر ان کا تعاقب ہی کر رہا ہے؟"

"تو تم ان کا تعاقب نہیں کر رہے تھے؟" کانسٹیبل نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔"

"یہ جھوٹ ہے کانسٹیبل صاحب" غزالہ نے جلدی سے کہا "یہ صاحب مستقل میرے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔"

"جی ہاں" جمیل نے بڑے طنزیہ لہجے میں جواب دیا "اور اب سوچ رہا ہوں کہ اس زمانے میں کسی کے ساتھ نیکی کرنا سب سے بڑی حماقت ہے۔ کانسٹیبل صاحب، ذرا آپ ہی ان سے پوچھئے کہ یہ جو بیگ اٹھائے چلی آ رہی ہیں کس کا ہے؟"

"جی۔ بیگ۔!" غزالہ نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑا ہوا بیگ کھول کر دیکھا، وہ خالی تھا۔

"کہئے اب ہوش ٹھکانے آئے یا نہیں؟" جمیل نے کہا اور کانسٹیبل سے مخاطب ہو کر بولا "بات یہ ہے جناب کہ یہ ایک پروفیسر صاحب قبلہ کی صاحب زادی ہیں۔ میرا دوست ایک پبلشر ہے اور اس نے ان کے والد صاحب کی ایک کتاب شائع کی ہے۔ میں اپنے دوست کی دکان میں کھڑا ہوا اس سے باتیں کر رہا تھا کہ یہ اپنے والد کی کتاب کے سلسلے میں معاوضے کی رقم کا چیک لینے آئیں۔ میرے دوست نے انہیں چیک دیا جو انہوں نے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ رسید کے طور پر انہیں ایک رجسٹر میں دستخط کرنا پڑے۔ دستخط کرنے کے لیے انہوں نے اپنا بیگ کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ وہیں پر میرا بیگ بھی رکھا تھا جو میں نے اپنی منگیتر کے لیے خریدا ہے۔ جب یہ چلنے لگیں تو اپنے بیگ کے بجائے میرا بیگ اٹھا کر لے آئیں۔ میں نے جب بیگ کھولا اور بدلا ہوا دیکھا تو ان کے پیچھے بھاگا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ میری غلطی تھی۔ مجھے چاہیے تھا کہ اطمینان سے پچیس ہزار کا بیئرر چیک کیش کراتا اور

مزے کرتا۔"

"میں..... میں معافی چاہتی ہوں" غزالہ کچھ روہانسی سی ہو گئی۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ بیگ بدل گیا ہے۔"

"یہ لیجئے اپنا بیگ" جمیل نے کہا "اور آئندہ کسی شریف نوجوان کی اس طرح توہین نہ کیجئے گا۔"

"لاحول ولاقوۃ" کانسٹیبل بڑبڑایا اور اپنی راہ چل دیا۔

"اب فرمایئے محترمہ غزالہ صاحبہ کیا خیال ہے گھر تک چلوں۔"

"جی!" غزالہ نے گھبرا کر جمیل کی طرف دیکھا۔

"اچھا جایئے معاف کیا" جمیل مسکرایا "فی الحال صرف آپ کا پتا معلوم کرنا تھا سو معلوم کرلیا۔ پروفیسر وحید الدین صاحب کوئی غیر معروف شخصیت نہیں ہیں۔ خدا نے چاہا تو دوسری ملاقات آپ کی کوٹھی پر ہوگی۔ اچھا بائی بائی۔"

جمیل گھوم کر تاج ریسٹورنٹ کے چوراہے کی طرف چل دیا۔ غزالہ حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ یہ خیال اسے بعد میں آیا کہ جمیل اپنا بیگ بھی اس کے پاس چھوڑ گیا ہے۔

O☆O

شاہد نے حیرت سے جمیل کی طرف دیکھا۔

"خیریت تو ہے؟" اس نے پوچھا "آج اس وقت کیسے؟"

"بس ایک ضروری کام نکل آیا تھا۔ میں نے سوچا تمہیں بھی ساتھ لیتا چلوں۔" جمیل نے جواب دیا۔

"کہیں چلنا پڑے گا؟"

"ہاں اور ابھی" جمیل نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "ٹھیک ساڑھے بارہ بجے کالج کا دفتر بند ہو جائے گا۔"

"کس کالج کی بات کر رہے ہو اور یہ اچانک کالج کے دفتر سے تمہیں کیا کام پڑ گیا؟"

"افوہ اب بحث ہی کیے جاؤ گے۔ جلدی سے کپڑے بدل کر آؤ۔"

"تم نہیں مانو گے" شاہد نے جیسے بہ مجبوری کہا "اچھا ٹھہرو، تمہارے لیے ڈرائنگ

روم کھول دوں۔"

"انکل تو نہیں ہیں گھر میں؟"

"وہ آج کل گھر کے علاوہ اور کہاں ہو سکتے ہیں؟"

"تو پھر رہنے دو۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"کون آیا ہے شاہد میاں؟" خان صاحب خود ہی تسبیح گھماتے ہوئے چلے آئے۔

"مر گئے" جمیل نے آہستہ سے کہا اور پھر بلند آواز میں بولا "السلام علیکم انکل! میں ہوں جمیل۔"

"وعلیکم السلام" خان صاحب نے بڑی قرات کے ساتھ جواب دیا "کہو میاں، خیریت سے تو ہو؟"

"جی ہاں خدا کا شکر ہے۔ بس آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

"بی اے پاس تو ہو گئے ہو گے؟" خان صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ خدا کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا۔"

"ماشاء اللہ، ماشاء اللہ" خان صاحب نے اظہار خوشنودی کے طور پر سر ہلایا "پھر اب کیا ارادہ ہے؟"

"ارادہ کیا انکل، میں نے ڈیڈی سے کہا کہ اب آپ آرام کریں اور مجھے اپنی خدمت کا موقع دیں۔ وہ بولے کہ پھر تو گھر گرہستی میں پڑ ہی جاؤ گے۔ ابھی ایک دو سال اور آزادی کے مزے لے لو۔ مگر میری طبیعت بیکاری سے بہت الجھتی ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ دو تین سال سروس ہی کر لوں۔ اپنا خرچ بھی چلتا رہے گا اور کچھ تجربہ بھی ہو جائے گا۔ چنانچہ آج کل شاہد کے ساتھ میں نے بھی دو چار جگہ ملازمت کی درخواستیں دے رکھی ہیں۔"

"ماشاء اللہ، ہونہار نوجوان ایسے ہی ہوتے ہیں" خان صاحب نے شاباشی دی "اس وقت کیسے آنا ہوا؟"

"کیا بتاؤں انکل، آج کل کے پڑھے لکھے نوجوانوں کو دیکھتا ہوں تو انتہائی افسوس ہوتا ہے۔ نہ نماز کے، نہ روزے کے۔ اپنے دین سے جیسے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا۔ محلے میں کوئی تفریحی پروگرام ہو تو دس ہاتھ بٹانے والے مل جائیں گے مگر عید میلادالنبی کا جلسہ ہو تو

سارا انتظام مجھ اکیلے کو کرنا پڑتا ہے۔ سوچا کہ شاہد کو ساتھ لے لوں کچھ تو مدد مل جائے گی۔"

"جزاک اللہ! واقعی نوجوانی کے عالم میں دین کی پابندی کرنا ایک جہاد سے کم نہیں ہوتا۔ ضرور لے جاؤ شاہد کو" خان صاحب نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "کب ہے یہ عید میلادالنبی کا جلسہ میں بھی شرکت کی سعادت حاصل کرلوں گا۔"

"ابھی تو مولانا عبداللہ صاحب سے وقت لینے جارہا ہوں' انہوں نے وعدہ کرلیا تو تاریخ کا اعلان بھی کردیا جائے گا" جمیل نے جواب دیا۔

خان صاحب کہیں باہر جارہے تھے۔ جزاک اللہ' ماشاءاللہ کہتے ہوئے وہ تو چلے گئے اور شاہد نے جمیل کی کمر پر ایک زور کی دھپ جمائی۔

"ابے مسخرے کم از کم دین کے معاملے میں تو اتنی بے باکی کے ساتھ جھوٹ مت بولا کر۔"

"اچھا اب تم کپڑے بدلنے جاتے ہو یا میں یونہی گھسیٹ کر لے چلوں" جمیل نے اسے گھر میں دھکا دیتے ہوئے کہا۔

اور پھر تقریباً پندرہ منٹ کے بعد دونوں اسلامیہ کالج جانے والی بس میں بیٹھے چلے جارہے تھے۔ بس نے انہیں ٹھیک اسلامیہ کالج کے گیٹ کے سامنے سڑک کے دوسری طرف اتار دیا۔ شاہد نے کالج کے طرف جانے کے لیے سڑک پار کرنا چاہی۔

"بس یہیں ٹھیک ہے" جمیل نے اس کا بازو پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔

"کیا ٹھیک ہے؟" شاہد نے حیرت سے پوچھا۔

"ہم یہیں پروفیسر صاحب کے نکلنے کا انتظار کریں گے" جمیل نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی "بارہ بج کر پچیس منٹ ہوئے ہیں صرف پانچ منٹ انتظار کرنا پڑے گا۔"

"کون پروفیسر صاحب۔"

"پروفیسر وحیدالدین صاحب۔"

"ان سے کچھ کام ہے۔"

"ہاں" جمیل نے کالج کے گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا!" شاہد نے پوچھا۔

"بس تقریب کچھ تو بہر ملاقات والی بات ہے۔"

"مگر کیوں۔"

"پرسوں ان کی صاحب زادی غزالہ کو دیکھا تھا۔"

"لاحول ولاقوۃ" شاہد نے غصے سے اپنا بازو چھڑایا "جانے کتنا ضروری کام میں گھر پر کررہا تھا کہ تم مجھے اس بے ہودگی کے لیے پکڑ لائے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کل اتنی شدت کے ساتھ تمہارے سر پر لڑکیاں کیوں سوار ہیں۔"

"آج کل" جمیل نے بھویں اچکائیں "کب نہیں تھیں بھیا" اپنی زندگی میں ان کے علاوہ رکھا ہی کیا ہے۔ چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط۔"

"ابھی تک جوتے پڑنے کی نوبت نہیں آئی ہے نا۔"

"اچھا بس" جمیل نے کہا "وہ دیکھو پروفیسر صاحب گیٹ سے نکل رہے ہیں۔ یہ جھگڑا پھر کرلینا ابھی تو تم میرے ساتھ چپ چاپ چلے آؤ۔"

"معلوم بھی تو ہو آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو۔"

"تم جانتے ہو کہ میں پیشگی پلان بہت کم بناتا ہوں۔" جمیل نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا "موقع محل کی مناسبت سے جو بات بھی فی البدیہہ سوجھ جائے وہی بہترین ہوتی ہے۔"

پروفیسر وحیدالدین صاحب کسی خیال میں غرق سر جھکائے ہوئے سیدھے فٹ پاتھ پر چلے جارہے تھے۔ جمیل نے سڑک کراس کی اور درمیان میں پندرہ بیس قدم کا فاصلہ قائم رکھتے ہوئے ان کے پیچھے چلنا شروع کردیا۔ تعاقب کا سلسلہ تقریباً ایک فرلانگ تک یونہی جاری رہا۔ اچانک پروفیسر صاحب چلتے چلتے رک گئے۔ چونک کر اپنے گردوپیش پر ایک نگاہ ڈالی۔ کچھ دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے واپس پلٹ پڑے۔ جمیل اور شاہد جلدی سے ایک طرف ہوگئے مگر پروفیسر صاحب ان کی طرف توجہ دیئے بغیر قریب سے گزر گئے۔

"آخر یہ جا کہاں رہے ہیں" شاہد نے پوچھا۔

"پتا نہیں شاید کالج میں کچھ بھول آئے ہوں" جمیل نے جواب دیا "تعاقب دوبارہ شروع ہوگیا۔"

جمیل اور شاہد کیفے ناز کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ پروفیسر وحید الدین صاحب ان سے دس قدم آگے تھے اور ایک مرتبہ پھر رک کر کچھ دیکھ رہے تھے۔ جمیل جلدی سے قریب ہی فٹ پاتھ پر ایک پان والے کی دکان کی طرف گھوم گیا جو نامعلوم کیوں مسکرا رہا تھا۔

"ایک پیکٹ ریڈ اینڈ وائٹ" جمیل نے دس کا نوٹ پھینکتے ہوئے کہا۔

دکان دار نے مسکرا کر سر جھٹکتے ہوئے الماری سے ریڈ اینڈ وائٹ کا ایک پیکٹ اٹھا کر جمیل کے ہاتھ میں دے دیا۔

"کیا بات ہے" شاہد نے دکان دار سے پوچھا "تم آپ ہی آپ ہنسے کیوں جا رہے ہو۔"

دکان دار نے یوں ایک قہقہہ لگایا جیسے وہ اس سوال کے انتظار ہی میں تھا۔

"آپ ان پروفیسر صاحب کو دیکھ رہے ہیں؟" وہ بولا۔

"تم انہیں جانتے ہو؟" جمیل نے جلدی سے پوچھا۔

"بہت اچھی طرح صاحب۔ روز میری دکان کے سامنے سے گزرتے ہیں۔"

"تو پھر اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے" شاہد نے پوچھا۔

"کالج سے نکل کر پروفیسر صاحب روزانہ کیفے ناز میں چائے پیتے ہیں" دکان دار نے بتایا "مگر غائب دماغی کا یہ حال ہے کہ میں نے کبھی پہلی کوشش میں آج تک انہیں کیفے تک پہنچتے نہیں دیکھا۔ سر جھکائے ہوئے آگے نکل جاتے ہیں پھر چونک کر پلٹتے ہیں اور اس مرتبہ دوسری سمت میں آگے بڑھ جائیں گے۔ کچھ دور جا کر پھر خیال آئے گا کہ کیفے تو پیچھے رہ گیا پھر واپس لوٹیں گے اور پھر اپنی رو میں دو چار قدم آگے نکل جائیں گے۔"

شاہد بھی ہنسنے لگا۔

"سوال یہ ہے کہ پھر کالج کس طرح پہنچتے ہوں گے؟" جمیل نے پوچھا۔

"اگر بس اسٹاپ اتفاق سے کالج کے سامنے نہ ہوتا تو وہاں بھی یہ تماشا ہوا کرتا" دکان دار نے جواب دیا۔

جمیل نے گردن گھما کر پروفیسر صاحب کی طرف دیکھا جو اس دوران میں کیفے ناز کی

سیڑھیوں تک پہنچ چکے تھے۔ اس نے سگریٹ والے سے بقیہ پیسے واپس لیے اور شاہد کا ہاتھ پکڑے ہوئے خود بھی کیفے کی طرف بڑھ گیا۔ یہ دونوں اندر پہنچے تو پروفیسر صاحب ویٹر کو چائے کا آرڈر دے رہے تھے۔ جمیل نے پروفیسر کے بالکل پیچھے والی میز پسند کی اور خود بھی دو اسپیشل چائے کا آرڈر دے دیا۔

ویٹر یقیناً پروفیسر صاحب سے اچھی طرح واقف ہوگا کہ اس نے محض چائے لا کر رکھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بنا بھی دی۔ پروفیسر صاحب خدا معلوم ذہنی طور پر کس مسئلے کو سلجھانے میں مصروف تھے۔ ہاتھ بڑھایا تو دودھ دانی ہاتھ میں آ گئی اور نہ صرف ہاتھ میں آئی بلکہ منہ تک بھی پہنچ گئی۔ ہونٹوں تک پہنچی تو انہیں کچھ اجنبیت کا احساس ہوا چونک کر پہلے دودھ دانی کو دیکھا اور پھر میز پر جہاں پیالی رکھی تھی۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے انہوں نے اسے رکھ دیا اور چائے کی پیالی اٹھا کر چائے پینے لگے۔ ایک پیالی چائے تقریباً پندرہ منٹ میں پی پھر سیدھا ہاتھ اٹھا کر قمیص کے پہلو میں لے گئے کچھ اس طرح کی حرکات کیں جیسے جیب ٹٹول رہے ہوں مگر جیب وہاں کہاں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھ وہاں سے پھسلتا پھسلتا پتلون کی جیب تک آ گیا۔ دوسرے لمحے ایک کاغذ لیے ہوئے برآمد ہوا جسے رومال سمجھ کر نہایت اطمینان سے ہونٹ پونچھے گئے اور دوبارہ جیب میں رکھ لیا گیا۔ اتنے میں ویٹر نے پلیٹ میں بل لا کر رکھ دیا۔ پروفیسر صاحب اٹھنے ہی لگے تھے کہ پلیٹ کو دیکھ کر رک گئے۔

"یہ کیا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"چائے کا بل ہے پروفیسر صاحب!" ویٹر نے جواب دیا "اور چائے آپ ابھی پی چکے ہیں۔"

ویٹر ہوشیار معلوم ہوتا تھا۔

"اچھا!" پروفیسر صاحب بولے "تو گویا ہمیں پیسے ادا کرنا ہیں۔"

"جی ہاں، صرف دس روپے" ویٹر نے جواب دیا۔

ایک مرتبہ پھر پروفیسر صاحب قمیص کے پہلو میں کوئی غیر مرئی جیب تلاش کر رہے تھے اس میں ناکام رہ کر پتلون کی جیبوں کا نمبر آیا۔ پھر قمیص کی اوپری جیب دیکھی گئی۔ ایک دم

سے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے پروفیسر صاحب کو سوتے سے جگا دیا ہو۔ انہوں نے چونک کر ویٹر کی طرف دیکھا اور پھر نسبتاً زیادہ حاضر دماغی سے جیبیں ٹٹولنے لگے۔

"کسی نے ہمارا بٹوہ پار کر دیا ہے" وہ گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔

"خدا کے لیے ذرا یاد کرنے کی کوشش کیجیے پروفیسر صاحب!" ویٹر نے برا سا منہ بنایا "آج آپ بٹوہ لائے بھی تھے یا نہیں؟"

"لائے کیوں نہیں تھے بھئی" پروفیسر صاحب نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا "کل ہی تو پبلشر صاحب کا پچیس ہزار کا چیک کیش کروا کے ہم نے پانچ ہزار خرچ کے لیے گھر میں دے دیئے تھے اور آج بیس ہزار ہم نے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرانے تھے' وہ بیس ہزار روپے ہم اپنے ساتھ لائے تھے۔"

"آپ کا مطلب ہے بٹوے میں پورے بیس ہزار روپے تھے؟" ویٹر نے کہا۔

"پچیس ہزار میں سے پانچ ہزار نفی کرنے کے بعد بیس ہزار ہی بچتے ہیں۔" پروفیسر صاحب نے جواب دیا "یہ تو اتنا مشکل سوال نہیں جو تمہاری سمجھ میں نہ آسکے۔"

"پھر تو ضرور کسی نے آپ کی جیب کاٹ لی۔"

"نہیں جیبیں تو سب ثابت ہیں' ہم نے دیکھ لیا ہے" پروفیسر صاحب نے سہلایا "کسی نے بٹوہ ہی اڑایا ہے۔"

"میرا مطلب بھی یہی تھا۔"

"اگر یہ تھا تو غلط تھا کیونکہ جیب کٹنا اور بٹوہ نکلنا دو علیحدہ علیحدہ افعال ہیں" پروفیسر صاحب نے سمجھانے کی کوشش کی "اور نتائج کے اعتبار سے بھی ان میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ جیب کا تراشا ہوا ہونا لازمی طور پر بٹوے کی گمشدگی کی وجہ نہیں ہوتا۔ عین ممکن ہے کہ جیب بٹوے کے سائز سے کم کاٹی گئی ہو اور اس طرح جیب کٹی ہونے کے باوجود بٹوہ نہ نکلے جبکہ بٹوے کا پار کیا جانا براہ راست عمل ہونے کی وجہ سے کسی شک کی گنجائش نہیں چھوڑتا۔ مزید بر آں ان دونوں افعال کے مرتکبین بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ جیب کاٹنے والے کو جیب تراش اور بغیر جیب کاٹے بٹوہ اڑانے والے کو یا پار کرنے والے کو چور اور اچکا کہا جاتا ہے اگر تم نے ان دونوں حرکات کو ایک ہی سمجھنے کی کوشش کی یا غلطی کی تو

اندیشہ ہے کہ ہمارا بٹوہ پار کیا ہو کسی اچکے نے اور تم کسی جیب تراش کو پکڑ کر اسے سزا دلوا دو۔"

ظاہر تھا کہ یہ علمی بحث غریب ویٹر کے پلے کیا پڑتی۔

"وہ تو ٹھیک ہے پروفیسر صاحب!" وہ سر کھجاتے ہوئے بولا "مگر اب اس بل کا کیا بنے گا؟"

"بل!" پروفیسر صاحب نے یوں کہا جیسے یہ کوئی مسئلہ ہی نہ ہو "بل کا کیا ہے' ہم کل ادا کر دیں گے۔"

"مگر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ واقعہ آپ کو کل تک یاد بھی رہ جائے گا؟" ویٹر نے بے چارگی سے جواب دیا۔

جمیل اپنی میز سے اٹھ کر پروفیسر صاحب کی میز پر پہنچا۔

"کیا بات ہے پروفیسر صاحب؟" اس نے پوچھا۔

"آپ کی تعریف؟" پروفیسر صاحب نے پہلی مرتبہ چشمے کو ناک پر سرکانے کی کوشش کی۔

"جی میں آپ کا شاگرد ہوں۔"

"نام؟" پروفیسر صاحب نے ایک انگلی اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"شاہد!" جمیل نے کھٹ سے جواب دیا۔

"رول نمبر؟" دوسری انگلی بھی اٹھ گئی۔

"فورٹی فور" جمیل نے فوراً کہا "اسے معلوم تھا کہ شاہد نے اسلامیہ کالج سے بی ایس سی پاس کیا ہے اور یہ کہ کلاس میں اس کا رول نمبر ۴۴ چوالیس تھا۔

"رائٹ" پروفیسر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا "ہاں اب بولو کیا کہہ رہے تھے؟"

"میں پوچھ رہا تھا کہ سر کیا بات ہے؟"

"پروفیسر صاحب کا بٹوہ کسی نے پار کر لیا ہے" ویٹر نے دس روپے ملنے کے امکان کے پیش نظر جلدی سے کہا۔

"تو تم دس روپے کے لیے اتنی دیر سے بحث کر رہے تھے" جمیل نے ڈانٹا "کیا تم

پروفیسر صاحب کو جانتے نہیں ہو۔"

"یہی تو ساری بات ہے کہ میں پروفیسر صاحب کو جانتا ہوں" ویٹر نے خوشامدانہ لہجے میں کہا "مجھے معلوم ہے کہ یہ رقم انہیں کل بالکل یاد نہیں رہے گی اور پہلے کی طرح سیٹھ یہ بھی میرے حساب میں کاٹ لے گا۔"

"اچھا زیادہ باتیں مت بناؤ" جمیل نے جیب سے دس کا نوٹ نکال کر ویٹر کے ہاتھ پر رکھ دیا "چلو بھاگو۔"

وہ پروفیسر صاحب کی طرف متوجہ ہوا۔

"عجیب بات ہے بلکہ اتفاق ہے سر!" وہ بولا "اس وقت میرے ساتھ ایشیا کے مشہور سراغ رساں جمیل مرزا بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ کا بٹوہ اگر کسی نے اڑا لیا ہے تو وہ یقیناً اسے برآمد کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"اگر کی گنجائش نہیں ہے صاحب زادے! ہمارا بٹوہ واقعی کسی نے پار کر دیا ہے۔"

"جی ہاں، جی ہاں۔ اس میز پر تشریف لے چلئے سر۔" جمیل نے جلدی سے کہا۔

پروفیسر صاحب دوسری میز کی طرف بڑھے۔ شاہد انہیں آتے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"جمیل بھائی!" جمیل نے شاہد کو آنکھ مارتے ہوئے کہا "آپ سے ملئے، آپ ہیں سائنس کے مشہور پروفیسر وحید الدین صاحب اور سر، یہ ہیں میرے دوست جمیل مرزا مایہ ناز سراغ رساں۔"

شاہد نے کسی قدر بوکھلائے ہوئے انداز میں پروفیسر صاحب سے ہاتھ ملایا۔ پروفیسر صاحب نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ کی صورت کچھ جانی پہچانی لگ رہی ہے۔۔۔" وہ جمیل کی طرف گھومے "کیا نام بتایا تھا تم نے؟"

"جمیل مرزا" جمیل نے جلدی سے کہا۔

"ہاں تو جمیل صاحب، میں کہہ رہا تھا کہ آپ کی صورت کچھ آشنا محسوس ہوتی ہے۔"

"ہو سکتا ہے سر" جمیل بولا "ملک کے اخباروں میں اکثر جمیل مرزا کی تصویریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔"

وہ موضوع بدلنے کی خاطر شاہد کی طرف گھوما "جمیل بھائی، کسی اچکے نے ہمارے پروفیسر صاحب کا بٹوہ پار کر دیا ہے۔"

"رائٹ" پروفیسر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ اتنے بڑے سراغ رساں ہیں کیا ایک معمولی بٹوے کا پتا نہیں لگا سکتے؟"

"معمولی نہیں صاحب زادے۔ اس میں پورے بیس ہزار روپے موجود تھے" پروفیسر صاحب نے تصحیح کی۔

"اچھا!" جمیل نے حیرت ظاہر کی "پھر تو اسے قیمتی ہی کہا جائے گا۔"

شاہد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس صورت حال سے کس طرح نمٹے، ایک طرف اسے اندیشہ تھا کہ کہیں پروفیسر صاحب اسے پہچان نہ لیں۔ دوسری طرف اس نے کبھی خواب میں بھی اپنے سراغ رساں ہونے کا تصور نہیں کیا تھا۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ایک سراغ رساں کی حیثیت سے اسے ایسے موقع پر کیا کہنا یا کرنا چاہیے اور نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ آخر جمیل کیا چکر چلا رہا ہے۔ پھر بھی اس نے ان دو چار جاسوسی ناولوں کے واقعات ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کی جو اس نے کبھی پڑھے تھے مگر اس جلدی اور گھبراہٹ میں کیا یاد آتا تھا۔

"میرا خیال ہے سر کہ آپ بٹوے کی گمشدگی کے سلسلے میں سلسلے وار واقعات بیان کر جائیں۔" جمیل نے شاہد کی پریشانی محسوس کرتے ہوئے کہا "اس طرح جمیل بھائی کو سراغ لگانے میں آسانی ہو گی۔ کیوں جمیل بھائی؟"

"جی ہاں جی ہاں، بالکل" شاہد جلدی سے بولا "واقعات معلوم ہوئے بغیر تو سراغ لگانا ممکن ہی نہیں ہے۔"

"رائٹ" پروفیسر صاحب نے تائید کی "مگر واقعات کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ میں صبح حسب معمول سو کر اٹھا، حسب معمول ناشتا کیا، حسب معمول لباس تبدیل کیا، حسب معمول کالج پہنچا، حسب معمول چھٹی ہوتے ہی یہاں چائے پینے آیا اور حسب معمول۔۔۔"

پروفیسر صاحب کہتے کہتے رک گئے۔ پھر نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں۔ بٹوہ حسب معمول غائب نہیں تھا۔ یہ بات البتہ معمول سے ہٹی ہوئی

ہے۔"

شاہد نے دیکھا کہ پروفیسر صاحب نے اسے مطلق نہیں پہچانا ہے تو رفتہ رفتہ اس کی ہمت عود کر آئی اور ہمت آئی تو ذہانت بھی پیدا ہوئی۔ وہ اب صورتِ حال میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ اس طرح کام نہیں چلے گا" اس نے کہا "میں سوال کرتا جاتا ہوں، آپ جواب دیتے جایئے۔ اس طرح مجھے اپنے ذہن میں واقعات کی ترتیب قائم کرنے میں آسانی ہوگی۔"

"رائٹ" پروفیسر صاحب نے حسبِ معمول کہا۔

"سب سے پہلے یہ بتایئے کہ آپ کو یاد ہے کل رات بٹوہ آپ کے پاس تھا۔"

"بالکل تھا۔ نہ ہوتا تو آج کوئی اسے میری جیب سے کس طرح پار کر سکتا تھا" پروفیسر صاحب نے دلیل دی۔

"آج صبح اٹھ کر آپ نے سب سے پہلے ناشتا کیا۔"

"سب سے پہلے نہیں حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے کے بعد۔"

"ناشتا آپ نے اکیلے کیا تھا" شاہد نے سوال کیا۔

"نہیں اپنی بیٹی غزالہ کے ساتھ۔"

"اس دوران کوئی آپ سے ملنے تو نہیں آیا۔"

"غزالہ کی امی کے سوا اور کوئی نہیں آیا تھا" پروفیسر صاحب نے بتایا "اور وہ بھی بیس ہزار روپے دینے آئی تھیں تاکہ میں انہیں کالج سے واپسی پر بینک میں جمع کرادوں۔"

"تو آپ کے بٹوے میں بیس ہزار روپے ان ہی کے دیے ہوئے تھے۔"

"رائٹ۔"

"بٹوے میں روپے انہوں نے خود رکھے تھے یا آپ نے؟" شاہد نے پوچھا۔

"انہوں نے میرے ہاتھ میں دیے تھے اور میں نے اٹھ کر بٹوے میں رکھے تھے" پروفیسر صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اور اس وقت بٹوہ کہاں رکھا تھا؟"

"میرے کوٹ کی جیب میں۔"

"اور کوٹ کہاں تھا؟"

"کپڑوں کی الماری میں" پروفیسر صاحب نے جواب دیا۔ شاہد نے چونک کر جمیل کی طرف دیکھا جو شوخ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کے ذہن میں بہ یک وقت ایک ہی خیال پیدا ہوا تھا۔

"آپ کا بٹوہ مل جائے گا پروفیسر صاحب" شاہد نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا "مگر۔۔۔"

"مگر اس کے لیے ہمیں آپ کے گھر جا کر موقع واردات کا جائزہ لینا ہوگا" جمیل نے جلدی سے شاہد کی بات کاٹتے ہوئے کہا "آپ یہی کہنا چاہتے تھے نا جمیل بھائی؟"

"جی ہاں، جی ہاں" شاہد نے سرہلایا۔ وہ اب سمجھ چکا تھا کہ جمیل، پروفیسر صاحب کے گھر تک پہنچنا چاہتا ہے۔

"آیئے تو پھر چلیں؟" پروفیسر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

جمیل نے چائے کا بل ادا کیا۔ دونوں پروفیسر صاحب کے دائیں بائیں چلتے ہوئے کیفے سے باہر آئے۔ شاہد نے ایک گزرتی ہوئی ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا۔

"آیئے بیٹھیے" جمیل نے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ پروفیسر صاحب آگے بڑھے۔ ایک قدم ٹیکسی کے اندر رکھا۔ دوسرا رکھنا ہی چاہتے تھے کہ رک گئے۔

"کیا ہوا پروفیسر صاحب!" شاہد نے پوچھا۔

"میں ابھی گھر کیسے جا سکتا ہوں" پروفیسر صاحب نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "غزالہ کی امی نے کہا تھا کہ مجھے بیس ہزار روپے بینک میں جمع کراتے ہوئے گھر جانا ہے۔"

"مگر آپ کا بٹوہ چوری ہو چکا ہے۔ روپے اسی میں تو رکھے تھے آپ نے۔"

"ایں!" پروفیسر صاحب چونکے "آپ ٹھیک کہتے ہیں یعنی حسبِ معمول رائٹ" اور یہ کہتے ہوئے وہ اندر بیٹھ گئے۔

"کہاں چلنا ہے صاحب!" ڈرائیور نے پوچھا۔

شاہد بیٹھ چکا تھا۔ جمیل نے بیٹھتے ہوئے پروفیسر صاحب کی طرف دیکھا۔

"پتے کا کارڈ بھی تو بٹوے میں ہی تھا" پروفیسر صاحب نے مایوسی سے گردن ہلائی "گلبرگ کالونی تو یاد ہے۔ مگر مکان کا نمبر میں ہمیشہ گڑبڑ کر جاتا ہوں۔"

"مجھے یاد ہے سر۔" جمیل نے کہا اور ڈرائیور کو پتا بتایا۔ "گلبرگ کالونی مکان نمبر ایک سو پانچ۔"

ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ٹیکسی اسٹارٹ کی۔ گلبرگ کالونی کا شمار شہر کی بہترین بستیوں میں ہوتا تھا۔ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے رہنے والوں کی اکثریت متوسط طبقے سے کچھ بلند معیار کی حامل تھی۔ چونکہ فی زمانہ آدمی کی حیثیت منتظمین شہر کی توجہ کے کم و بیش ہونے کا پیمانہ ہوا کرتی ہے اس لیے ظاہر ہے کہ کارپوریشن کی نظر عنایت بھی اسی طرف مائل ہونا چاہیے تھی اور وہ تھی جس کا مظاہرہ صاف و شفاف پختہ سڑکیں جگہ جگہ پر فضا پارک اور زندگی کی دوسری سہولتوں کی صورت میں پوری فراخ دلی سے کیا گیا تھا۔

ٹیکسی بنگلہ نمبر ۱۰۵ کے گیٹ کے سامنے رکی۔ پہلے جمیل پھر شاہد اور پھر پروفیسر صاحب ٹیکسی سے اترے۔ جمیل نے کرایہ ادا کیا۔ پروفیسر صاحب اپنے ایک شاگرد عزیز اور ایک مایہ ناز سراغ رساں کو جلو میں لیے ہوئے بنگلے میں داخل ہوئے اور سیدھے اپنے کمرے میں پہنچے۔

"تو یہ ہے آپ کا کمرا؟" شاہد نے کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"رائٹ" پروفیسر صاحب نے گویا جواب دیا۔

کمرے کے ایک کونے میں کتابوں کی دو بھری ہوئی الماریوں کے ساتھ ایک میز اور چند کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ یہ حصہ گویا پروفیسر صاحب کا اسٹڈی روم تھا۔

"ناشتا آپ نے اس میز پر کیا تھا؟"

نے ایک ایسے دروازے کی طرف اشارہ کیا جو یقیناً گھر کے اندر ہی کھلتا ہے۔

"رائٹ۔"

"اور آپ کے کپڑے شاید اسی الماری میں رکھے ہوتے ہیں؟"

"رائٹ۔"

"ناشتے سے فارغ ہو کر آپ نے لباس تبدیل کیا" شاہد نے الماری کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک سگریٹ پینے کے بعد۔"

"پہلے قمیص پہنی اور پھر پتلون؟" شاہد نے الماری کھول کر جھانکا۔

"رائٹ۔"

"پھر الماری سے کوٹ نکالا' وہی کوٹ جس میں آپ نے بٹوا رکھا تھا" شاہد نے ہاتھ بڑھا کر الماری میں لٹکا ہوا کوٹ نکال لیا اور پھر پروفیسر صاحب کی طرف دیکھا۔

"رائٹ۔"

"اور پھر اس طرح پہلے آپ نے ایک آستین میں ہاتھ ڈالا" اس نے ... پروفیسر صاحب کو کوٹ پہناتے ہوئے کہا "اور پھر دوسری میں۔ کوٹ کا کالر درست کیا' بٹن لگائے؟"

"رائٹ۔"

"بس تو پھر سمجھ لیجیے میں نے آپ کے بٹوے کا سراغ لگا لیا۔" شاہد نے مسکراتے ہوئے کہا اور نہایت اطمینان سے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوہ نکال لیا "یہ دیکھیے یہی ہے نا آپ کا بٹوہ؟"

"کمال ہے؟" پروفیسر صاحب کی حیرت دیکھنے کے قابل تھی "یہ آپ کو کہاں سے ملا؟"

"بس یہ نہ پوچھیے سر!" جمیل نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا "یہ سراغ رسانی کے راز ہیں اور جمیل بھائی ایک ٹریڈ سیکرٹ کی طرح ان کی حفاظت کرتے ہیں۔"

"بٹوہ موجود ہے تو روپے بھی موجود ہوں گے" پروفیسر صاحب نے بٹوہ جیب میں رکھتے ہوئے جواب دیا "مگر صاحب واقعی مجھے حیرت ہو گئی' کوئی شک نہیں....."

وہ جمیل کی طرف گھومے "کیا نام بتایا تھا بھئی تم نے؟"

"جمیل صاحب۔"

"جی ہاں۔ کوئی شک نہیں جمیل صاحب اپنے دور کے عظیم سراغ رساں ہیں" پروفیسر صاحب نے کہا "مگر آپ کھڑے کیوں ہیں؟ تشریف رکھیے' کھانا وغیرہ کھا کر جائیے گا۔"

اتنے میں وہی دروازہ جس کی طرف شاہد نے اشارہ کیا تھا' کھلا اور غزالہ اندر داخل ہوئی' پہلے اس کی نگاہ شاہد پر اور پھر جمیل پر پڑی۔ جمیل کو دیکھ کر وہ چونکی مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہے' پروفیسر صاحب بول پڑے۔

"ان سے ملو بیٹی!" انہوں نے کہا "یہ ہیں ہمارے ملک کے بہترین سراغ رساں مسٹر۔" انہوں نے جمیل کی طرف دیکھا۔

"مسٹر جمیل مرزا" جمیل ان کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"ہاں مسٹر جمیل مرزا" پروفیسر صاحب نے فقرہ پورا کرتے ہوئے کہا "اگر آج یہ نہ ملتے تو سمجھو کہ میرا بٹوہ بھی نہ ملتا اور تمہیں معلوم ہے' بٹوے میں تمہاری امی کے دیے ہوئے پورے بیس ہزار روپے رکھے تھے۔"

"کہیں کھو گیا تھا؟" غزالہ نے پوچھا۔

"کھو نہیں گیا تھا بیٹی کسی اچکے نے نکال....." پروفیسر صاحب ایک دم کہتے ہوئے رک گئے۔

"کیا نام مسٹر آپ کا؟" وہ شاہد سے مخاطب ہوئے "بہر حال جو کچھ بھی ہو۔ آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اس اچکے کا کیا بنا جس نے میرا بٹوہ چرایا تھا۔"

شاہد ایک لمحے کے لیے بالکل گھبرا گیا۔ جمیل نہ ہوتا تو یقیناً بھانڈا پھوٹ ہی گیا تھا۔

"آپ نے دیکھا نہیں کہ جمیل بھائی نے کیفے ناز سے نکلتے ہی اسے پکڑ لیا تھا" جمیل نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔ وہ جانتا تھا کہ پروفیسر صاحب اپنے گرد و پیش سے کتنے

انجان رہتے ہیں یقیناً انہوں نے غور نہیں کیا ہو گا کہ ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر تک پہنچے ہیں یا کسی کار میں۔

"جی ہاں" شاہد سنبھل گیا "بات دراصل یہ ہے کہ عموماً بڑے ہوٹلوں' ریستورانوں وغیرہ کے باہر جیب کترے اور چور اچکے شکار کی تلاش میں گھومتے پھرتے ہیں۔ آپ نے جو کچھ حالات بیان کیے' ان کی بنیاد پر مجھے یقین ہو گیا کہ کالج سے نکلنے تک بٹوہ محفوظ تھا۔ کیفے میں ہم لوگ موجود تھے۔ اگر کوئی آدمی ہاتھ کی صفائی دکھاتا تو ہماری نظروں سے بچ نہیں سکتا تھا اس لیے لامحالہ کالج کے گیٹ سے کیفے کے درمیان کسی نے بٹوہ پار کیا تھا۔ اسی اندازے کی بنا پر میں باہر نکلا تو چور فوراً میری نگاہ میں آ گیا۔ وہ اس وقت ایک اور شکار کی تاک میں تھا' میں نے جاتے ہی اسے پکڑ لیا۔"

"اور پھر اتفاق سے اسی وقت انسپکٹر چنگیزی اپنی کار میں کیفے کے سامنے سے گزر رہے تھے" جمیل نے باقی داستان پوری کرتے ہوئے کہا "جمیل بھائی نے فوراً انہیں روک کر ساری بات بتائی اور چور کو ان کی حراست میں دے دیا۔ آپ نے شاید غور نہیں کیا وہی تو اپنی کار میں ہمیں یہاں چھوڑ گئے ہیں۔"

"واقعی!" پروفیسر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا "میں نے تو یہ دیکھا تھا کہ کوئی صاحب اگلی سیٹ پر خاکی وردی پہنے ہوئے بیٹھے ہیں۔"

وہ غزالہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

"بہر حال تو تم نے دیکھا بیٹی' کہ اس طرح اگر آج یہ..... کیا نام..... میرا مطلب ہے کہ یہ لوگ موجود نہ ہوتے تو ہزاروں روپے کا نقصان ہو گیا تھا۔"

"پھر تو جمیل صاحب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں" غزالہ نے شاہد کی طرف دیکھا۔

"اب غالباً آپ میرا نام جاننا چاہیں گی" جمیل نے فوراً کہا "تو اس ناچیز کو شاہد کہتے ہیں اور پروفیسر صاحب میرے استاد ہیں۔"

"ہاں بیٹی' میں..... ان صاحب زادے سے تمہارا تعارف کرانا تو بھول ہی گیا" پروفیسر صاحب نے کہا اور جمیل و شاہد کی طرف دیکھ کر بولے "تو اب آپ لوگ کھانا کھا کر ہی

جائیں گے نا؟"

"ارے نہیں پروفیسر صاحب' اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟" شاہد نے جلدی سے کہا "ہم لوگ کیفے میں کھانا کھانے ہی تو گئے تھے۔"

"اچھا تو پھر چائے میں تو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے" پروفیسر صاحب اٹھتے ہوئے بولے "بیٹی' تم ذرا مہمانوں کو چائے وغیرہ پلاؤ' میں کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"آیئے" غزالہ شاہد اور جمیل کمرے سے باہر نکلے۔ شاہد ارادتاً پھر کچھ پیچھے رہ گیا۔

"تو آپ آخر کار گھر تک پہنچ ہی گئے" غزالہ نے جمیل کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں مجبوراً آنا ہی پڑا" جمیل نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"مجبوراً؟" غزالہ نے سوالیہ انداز سے دہرایا۔

"آپ بھول رہی ہیں کہ اس دن آپ میری ایک چیز اپنے ساتھ لے آئی تھیں" جمیل نے کہا۔

"اوہ... آپ کا مطلب غالباً بیگ سے ہے؟"

"جی نہیں۔"

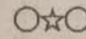
"تو پھر؟"

"آپ نے غالباً ابھی تک بیگ کھول کر نہیں دیکھا؟"

"جی نہیں تو..." غزالہ نے کچھ تعجب سے پوچھا "کیا اس میں کوئی خاص چیز تھی؟"

"جی ہاں... میرا دل" جمیل بڑے رومانی لہجے میں بولا۔

اور غزالہ نے دل کی بڑھتی ہوئی دھڑکنوں کے ساتھ اپنے کان کی لویں سرخ ہوتے ہوئے محسوس کیں۔ بے اختیار اس نے پلٹ کر شاہد کی طرف دیکھا جو کئی قدم کے فاصلے پر سر جھکائے چلا آرہا تھا۔



عزیز اسپتال اور میٹرنٹی ہوم نہ صرف مسلم ٹاؤن کے علاقے میں بلکہ پورے شہر میں اپنے حسن انتظام' جدید میڈیکل سہولتوں اور مخلص اسٹاف اور سب سے زیادہ اپنے جائز

ومناسب واجبات کی وجہ سے کافی شہرت رکھتا تھا۔ اسی شہرت کا نتیجہ تھا کہ متعلقہ علاقے کے لوگ ہی نہیں بلکہ پورے شہر کے مریضوں کی بڑی تعداد عزیز اسپتال اور میٹرنٹی ہوم سے رجوع کرتی تھی۔

اسپتال میں بیک وقت سو مریضوں کے قیام کا انتظام تھا۔ ہنگامی حالات میں دس پانچ بستروں کا علیحدہ انتظام ہو سکتا تھا۔ اسی طرح میٹرنٹی ہوم میں پچاس بستر جنرل وارڈ میں اور اتنے ہی پرائیویٹ کمرے میں (جنہیں سنگل اور ڈبل کے مزید دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا) ضرورت مندوں کے کام آنے کے لیے مزید موجود تھے۔ ظاہر ہے اتنے بڑے اسپتال کے لیے عملہ بھی بڑا تھا اور اتنا ہی نہیں دواؤں کی رسد مناسب داموں پر برقرار رکھنے کے لیے اسپتال کا اپنا ایک میڈیکل اسٹور بھی تھا۔

ڈاکٹر عزیز الحق جو اس ادارے کے بانی مالک اور منتظم اعلیٰ تھے' بڑے قومی جذبے کے تحت دکھی انسانوں اور انسانیت کی خدمت کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنا جو اصول شروع میں بنایا تھا اسی پر آج بھی عمل پیرا تھے اور وہ یہی تھا کہ قوم کی خدمت کسی منافع بخش کاروباری نیت سے نہیں بلکہ ایک ذمے داری اور فرض سمجھ کر انجام دیں گے۔ اسپتال اور میٹرنٹی ہوم سے ہزاروں لاکھوں کی آمدنی ہو سکتی تھی مگر اول تو انہوں نے نہایت مناسب واجبات مقرر کر کے اس کی گنجائش ہی بہت کم چھوڑی تھی اور اس پر بھی جو کچھ ملتا تھا' اس کا بیشتر حصہ وہ اسپتال اور اس کے عملے پر ہی خرچ کر دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے اسٹاف کو جو تنخواہ ملتی تھی دوسرے میڈیکل اداروں کے ملازم ان کی آرزو ہی کر سکتے تھے۔ خود ڈاکٹر صاحب کا رہن سہن بہت سادہ اور تکلفات سے بالکل عاری تھا۔ اسپتال سے ملحق ہی ایک چھوٹا سا بنگلہ انہوں نے اپنے اور اپنے مختصر خاندان کی رہائش کے لیے بنوالیا تھا۔ جہاں ڈیوٹی کے اوقات کے علاوہ بھی دن و رات میں کسی بھی وقت حاجت مند ان سے رجوع کر سکتے تھے اور کرتے رہتے تھے۔

ان حالات میں جبکہ اسپتال میں کسی چپراسی کی ضرورت کا اشتہار بھی دیا جاتا تو ایک جگہ کے لیے بے شمار درخواستیں آجایا کرتی تھیں تو چیف اسٹور کیپر جیسی پوسٹ کے لئے سیکڑوں امیدوار کیوں نہ رجوع کرتے۔

چنانچہ جمیل نے شاہد کے ساتھ اسپتال کے کمپاؤنڈ میں قدم رکھا تو اسپتال کے مین آفس کے سامنے کا پورا لان امیدواروں سے بھرا ہوا تھا۔

"بھائی اس جم غفیر میں ہماری حیثیت ہی کیا ہے" شاہد نے قدرے مایوسی سے کہا "معلوم ہوا ہے کہ فرسٹ کلاس ایم ایس سی امیدواروں کی بھی لاتعداد درخواستیں پہنچ چکی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں وقت ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ چلو کہیں اور قسمت آزمائی کریں۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ میں نے بھی درخواست دی ہے۔" جمیل نے کہا۔

"ہاں۔ اور محض حماقت کی ہے" شاہد بولا "یہاں بی ایس سی کی دال گلتی نظر نہیں آتی تو بی اے فیل کو کون پوچھے گا؟"

"بس یہی تمہاری سمجھ کا قصور ہے" جمیل نے جواب دیا "چھوکری اور نوکری سند دیکھ کر نہیں ملا کرتی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ کیا بے تکی باتیں کرتے ہو۔ لڑکی اور ملازمت میں کیا تعلق؟" شاہد نے منہ بناتے ہوئے کہا "تم سمجھتے ہو کہ جس طرح اپنے ہتھکنڈوں سے لڑکیوں کو رجھالیا کرتے ہو، اسی طرح انٹرویو بورڈ کے ممبران بھی فریفتہ ہو کر تمہیں اس جگہ کے لیے منتخب کرلیں گے؟"

"جہاں تک تعلق کا سوال ہے تو علامہ اکبر الہ آبادی مرحوم پہلے ہی سروس یعنی ملازمت کو لیلیٰ سے تشبیہ دے چکے ہیں۔ تم تو شاعر آدمی ہو، ان کا یہ شعر تو ضرور ہی سنا ہوگا کہ۔

شوق لیلائے سول سروس نے اس مجنون کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کردیا پتلون کو

اور لیلیٰ کے بارے میں تمام روایتیں اس کے لڑکی ہونے پر متفق ہیں۔ اس کے علاوہ لڑکی اور ملازمت کے تعلق کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ ہمارے معاشرے میں لوگ لڑکی دینے سے پہلے ملازمت کے بارے میں اطمینان کرلینا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اب رہا تمہارا یہ کہنا کہ لڑکیوں کی طرح انٹرویو بورڈ کے ممبران بھی مجھ پر فریفتہ ہوتے ہیں یا نہیں تو

بھیا اس کا ثبوت تمہیں عنقریب مل جائے گا مگر پہلے میں ذرا اس ہجوم عاشقاں کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ موجودہ صورت میں تو اپنا نمبر واقعی ایک ہفتے میں آئے گا۔"

جمیل مین آفس کی طرف بڑھا جہاں ایک چپراسی امیدواروں کے نام پکار پکار کر انہیں انٹرویو کے لیے بھیجتا جا رہا تھا۔

"انٹرویو کون لے رہا ہے؟" جمیل نے ایک امیدوار سے پوچھا۔

"پتا نہیں، سنا ہے ڈاکٹر عزیز الحق صاحب خود بھی موجود ہیں" امیدوار نے جواب دیا۔

"آپ کو معلوم ہے وہ کس نوعیت کے سوالات پوچھ رہے ہیں؟" جمیل نے کہا۔

"نہیں تو۔"

"مگر مجھے معلوم ہے۔"

"اچھا!" امیدوار نے غور سے جمیل کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں۔ میں نے باہر نکلنے والے بیس پچیس امیدواروں سے گفتگو کی ہے" جمیل نے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا "اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ڈاکٹر عزیز الحق ہر امیدوار سے کم از کم تین سوالات بالکل ایک جیسے کر رہے ہیں۔"

یہ گفتگو سن کر قریب کے چار پانچ نوجوان اور بھی متوجہ ہو چکے تھے۔

"وہ کیا سوالات ہیں؟" ایک امیدوار نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"سب سے پہلا یہ کہ میرے مختصر حالات زندگی بتاؤ۔"

"آپ کے؟" کسی نے دریافت کیا۔

"افوہ بھئی ڈاکٹر عزیز الحق صاحب پوچھتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کا مقصد اپنے حالات زندگی سے ہوگا۔ بات معقول ہے۔ جس شخص کو ادارے کے بانی سے اتنی بھی دلچسپی نہ ہو کہ اس کے بارے میں کچھ جانتا ہو، وہ اس ادارے میں ملازمت کا مستحق کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ لوگوں کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ جمالستان پبلشرز نے ڈاکٹر عزیز الحق اور ان کی طبی خدمات پر ایک کتاب حال ہی میں شائع کی ہے۔ جس میں ان کی زندگی کے حالات بھی دیئے گئے ہیں۔"

"دوسرا سوال کیا ہے؟" ایک جانب سے آواز آئی۔

"یہ کہ کم سے کم پچاس انگریزی دواؤں کے نام زبانی سناؤ۔" جمیل نے کہا "اس کی معقولیت میں بھی کوئی شبہ نہیں۔ پوسٹ چیف اسٹور کیپر کی ہے۔ جو امیدوار پچاس دواؤں کے نام بھی زبانی یاد نہ رکھ سکتا ہو' وہ اسٹور کی ہزاروں دواؤں کو کیسے یاد رکھے گا؟"

"اور تیسرا سوال؟"

"تیسرا سوال' سوال سے زیادہ مطالبہ ہے۔" جمیل بولا "ڈاکٹر صاحب ہر امیدوار سے کم سے کم دس روپے اسپتال ریلیف فنڈ کے بکس میں ڈالنے کو کہتے ہیں جو ان کے سامنے ہی میز پر رکھا ہے۔ مگر ظاہر ہے جو امیدوار جتنا زیادہ چندہ دے گا اتنا ہی اس کی کامیابی کے امکانات بھی زیادہ ہو جائیں گے۔"

جمیل خاموش ہوا تو تیس چالیس امیدواروں کے ہجوم میں چہ میگوئیاں اور سرگوشیاں شروع ہو چکی تھیں۔ سب سے پہلے چار پانچ امیدواروں کا ایک مختصر سا گروہ تیز تیز قدموں سے گیٹ کی طرف چلا۔ جمیل اتنی دیر میں دوسری طرف مزید بیس پچیس امیدواروں کو اپنے گرد جمع کر چکا تھا۔ شاہد آفس کی سیڑھیوں پر کھڑا ہوا حیرت سے اس کی سرگرمیوں کو دیکھ رہا تھا مگر دور ہونے کی وجہ سے جو کچھ کہا جا رہا تھا' سننے سے مجبور تھا۔ باہر جانے والوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی تھی اور اسی مناسبت سے جمیل کی نقل و حرکت بھی۔ نصف گھنٹے کے اندر بیشتر امیدوار ایک دوسرے سے کانا پھوسی کرتے نظر آ رہے تھے اس وقت دن کے بارہ بج چکے تھے۔ انٹرویو کا سلسلہ صبح آٹھ بجے سے جاری تھا اور ابھی تک بمشکل تمام چالیس امیدواروں کا انٹرویو لیا جا سکا تھا۔ اچانک کمرے سے ایک کلرک باہر نکلا اور اس نے اعلان کیا کہ انٹرویو لنچ کے لیے پینتالیس منٹ کے لیے ملتوی کیا جا رہا ہے اور اب دوبارہ ایک بجے شروع ہو گا۔ اعلان سنتے ہی امیدوار گیٹ کی طرف بھاگے۔ جمیل کی کوششیں رنگ لائی تھیں اور امیدوار اس وقفے کو غنیمت خیال کرتے ہوئے مطلوبہ سوالات کے جوابات جلد سے جلد حاصل کر لینا چاہتے تھے۔

"چلیے حضرت" شاہد نے جمیل کا بازو پکڑتے ہوئے کہا "اب ایک بجے تک چھٹی ہے کچھ پیٹ پوجا کرنی چاہیے۔"

"جی نہیں ہم بالکل نہیں جائیں گے" جمیل نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ سب سے پہلے ہمارا انٹرویو لیا جانے والا ہے۔"

"جی ہاں آپ میں سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں نا کہ دو تین سو باقی لوگوں کو چھوڑ کر سب سے پہلے آپ کو شرف باریابی عطا کیا جائے گا؟"

"تم دیکھ لینا" جمیل نے بڑے وثوق سے کہا اور وہیں لان پر ٹانگیں پھیلا کر اطمینان سے لیٹ گیا۔

پھر شاہد نے حیرت سے دیکھا کہ ایک بجنے کے باوجود دو تین سو امیدواروں میں سے ابھی تک کسی ایک کا بھی پتا نہیں ہے۔ ٹھیک ایک بجے انٹرویو کی کارروائی دوبارہ شروع ہوئی تو کلرک نے غالباً یہ عجیب صورت حال اندر جا کر بیان کی ہو گی کہ ڈاکٹر عزیز الحق خود باہر نکل کر آئے۔ پہلے ادھر ادھر دیکھتے رہے پھر جمیل اور شاہد کو اشارے سے قریب بلایا۔

"تم لوگوں نے بھی ملازمت کے لیے درخواست دی ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی ہاں" جمیل نے پوچھا۔

"باقی لوگ کہاں چلے گئے؟" ڈاکٹر صاحب نے سوال کیا "کیا کلرک نے غلط ٹائم کا اعلان تو نہیں کیا تھا؟"

"جی نہیں۔"

"تم دونوں کے نام کیا ہیں؟"

"جمیل احمد۔"

"شاہد علی خان۔"

ڈاکٹر صاحب' کلرک کی طرف گھومے۔

"سردست ان دونوں کو اندر بھیجو۔ ممکن ہے اس وقت تک دوسرے لوگ بھی آجائیں۔"

"جی بہت اچھا" کلرک نے جواب دیا۔

اور اس طرح جمیل کا کہنا حرف بہ حرف پورا ہوا۔ ایک بج کر دس منٹ پر وہ انٹرویو بورڈ کے تین ممبران کے سامنے کھڑا ہوا سوالات کے جوابات دے رہا تھا۔

"تمہارا نام جمیل احمد ہے؟" ڈاکٹر عزیز الحق نے اسے سر سے پیر تک بڑے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"اس پوسٹ کے لیے اخبارات میں جو اشتہار دیا گیا تھا تم نے اسے غور سے پڑھا تھا؟"

"جناب کسی اخبار میں غور سے پڑھنے کی چیز صرف اشتہارات ہی ہوا کرتے ہیں۔"

ظاہر تھا کہ اس جواب کے بعد ڈاکٹر صاحب وہ سوال نہیں پوچھ سکتے تھے جو انہوں نے سوچ رکھا تھا۔

"تمہارا مطلب ہے۔" انہوں نے دلچسپی سے پوچھا "کہ خبریں پڑھنے کی چیز نہیں ہوتیں حالانکہ وہ اخبار کا بنیادی جز سمجھی جاتی ہیں۔"

"اس معاملے میں مجھے آپ سے اختلاف ہے جناب! میں نے خبر نام کی کوئی چیز برسوں سے کسی اخبار میں نہیں دیکھی" جمیل نے جواب دیا "اور کسی واقعے کے بارے میں مدیر، نائب مدیر، نیوز ایڈیٹر، رپورٹر، فوٹو گرافر اور کاتب صاحبان یا ان جملہ حضرات کے جملہ عزیز واقارب اور دوست احباب کے ذاتی تاثرات یا پروپیگنڈے کو آپ خبر نہیں کہہ سکتے۔ لیکن یہ بحث طویل ہو سکتی ہے اس لیے مختصر طور پر اتنا عرض کروں گا کہ خبروں کے نام پر پروپیگنڈا ہو یا اشتہارات، دونوں کا مقصد لوگوں کو بے وقوف بنانا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پروپیگنڈا پڑھنے والے اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے بے وقوف بنتے ہیں اور میں اشتہارات پڑھتا ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے بے وقوف بنانے کے لیے بہر حال مشتہرین نے ایک بھاری رقم ادا کی ہے۔"

"بہت خوب" ڈاکٹر عزیز الحق نے کہا "اگر تم اشتہار پڑھتے ہو تو کیا تم نے یہ نہیں پڑھا تھا کہ ہمیں جگہ کے لیے بی ایس سی امیدواروں کی ضرورت ہے؟"

"میں نے پڑھا تھا جناب!" جمیل نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔

"اس کے باوجود تم نے درخواست بھیج دی جبکہ تم بی ایس سی تو کجا بی اے پاس بھی نہیں ہو۔"

"جناب اشتہارات کا غور سے پڑھنا اور بات ہے اور اس پر یقین کرنا بالکل دوسری بات" جمیل نے بڑی متانت سے کہا "میرے ایک دوست نے اشتہار پر یقین کر کے ایک بار کالا تیل منگوالیا تھا نتیجہ یہ ہے کہ آج کل وہ گنجے پن کی دوا تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ خود آپ نے بھی طلسمی انگوٹھی اور ہر مراد پوری ہوگی وغیرہ کے اشتہارات ضرور پڑھے ہوں گے لیکن ایک مرتبہ بھی ان پر یقین کر کے انگوٹھی نہیں خریدی ہوگی۔"

"لیکن ہمارے اشتہار میں بی ایس سی پاس ہونے کی شرط بالکل سچ تھی" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "اس لیے مجھے افسوس ہے کہ تمہاری اس چرب زبانی کے باوجود تمہیں نہیں رکھا جا سکتا۔"

"مجھے بھی افسوس ہے جناب!" جمیل نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "کہ جب میں اپنی موجودہ قابلیت کے باوجود قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی رکنیت جیسے ذمے دار اور اہم منصب کے لیے کوشش کر سکتا ہوں تو میں نے ایک معمولی اسٹور کیپر کی پوسٹ کے لیے درخواست دینے میں وقت کیوں ضائع کیا؟"

جمیل باہر نکلا تو شاہد کا نام پکارا گیا۔ شاہد نے اندر جاتے ہوئے جمیل کے چہرے سے اس کے تاثرات معلوم کرنا چاہے مگر کچھ اندازہ نہیں لگا سکا۔ اس وقت تک اکا دکا امیدوار بھی نظر آنے لگے تھے اور ہر ایک کی بغل میں ایک ایک کتاب دبی ہوئی تھی جو بالکل نئی خریدی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ شاہد کو دوسرے امیدواروں سے کچھ زیادہ ہی وقت لگا۔ جمیل اس کی واپسی تک بڑے اطمینان سے لان کی گھاس پر بیٹھا ہوا تھا اور سگریٹ پھونک رہا تھا۔ شاہد باہر آیا تو اس کے چہرے کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ انٹرویو خاصا کامیاب رہا ہے۔

"یار، یہ ڈاکٹر عزیز الحق صاحب تو بڑے معقول آدمی معلوم ہوتے ہیں" اس نے آتے ہی جمیل سے کہا "کہہ رہے تھے کہ انہیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ملک میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری نے ایم ایس سی پاس امیدواروں کو بھی ایک معمولی اسٹور کیپر کی ملازمت کے لیے درخواست دینے پر مجبور کر دیا ہے مگر ان کا کہنا ہے کہ وہ اس جگہ کے لیے صرف بی ایس سی امیدواروں میں سے ہی کسی کا انتخاب کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے تمام

سوالات کے جوابات بہت مناسب دیئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب متاثر معلوم ہوتے تھے۔ اگر ایم ایس سی امیدواروں کا واقعی کوئی خطرہ نہیں ہے تو پھر مجھے یہ جگہ پانے کی کافی امید ہو چلی ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ، تمہارے ساتھ کیا رہا؟"

"تم بے کار خوش ہو رہے ہو" جمیل نے سگریٹ کا ٹوٹا گھاس پر مسلتے ہوئے کہا "یہ جگہ تو میرے نام الاٹ ہو چکی ہے۔"

"اچھا!" شاہد نے حیرت سے کہا "کیا ڈاکٹر صاحب نے کہہ دیا ہے؟"

"نہیں" جمیل نے کھڑے ہو کر کہا "ڈاکٹر صاحب نے تو بڑی ہی شرافت سے معذرت کا اظہار کر دیا ہے مگر تم دیکھتے جاؤ، اپائنٹمنٹ میرا ہی ہوگا۔"

جمیل اسپتال کے گیٹ کی طرف چلنے لگا۔

"اب کہاں کا ارادہ ہے؟" شاہد نے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

"گلبرگ کالونی کا۔ چل رہے ہو؟"

"یار! تم اس سیدھی سادی لڑکی کو کیوں بے وقوف بنا رہے ہو۔" شاہد نے کہا۔

"کون سی سیدھی سادی لڑکی؟" جمیل نے جواب دیا "میں نے تم سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ ہمیشہ نام لے کر بات کیا کرو۔ یہاں اتنی سیدھی سادی لڑکیاں اسٹاک میں ہیں کہ کچھ پتا نہیں چلتا کہ تمہارا اشارہ کس طرف ہے۔"

"میرا مطلب غزالہ سے تھا۔"

"اوہ۔ تو پھر تمہیں سن کر خوشی ہوگی کہ میں نے اس کا خیال چھوڑ دیا ہے۔" جمیل نے بتایا "کل شام وہ مون لائٹ کلب میں ملی تھی، ہم دونوں بیٹھے ہوئے بڑی رومان انگیز باتیں کر رہے تھے اور میرا کوئی ارادہ مستقبل قریب میں ترک تعلق کا نہیں تھا اچانک اس کی آنکھیں مچمچائیں، ناک کے نتھنے پھڑکے، ہونٹوں کا زاویہ ٹیڑھا ہو گیا اور اس نے بغیر کسی پیشگی وارننگ کے اتنے خوفناک انداز میں چھینکا کہ میرے تمام لطیف جذبات سہم کر رہ گئے۔ بھلا جو لڑکی چھینکنے کا بھی سلیقہ نہ جانتی ہو اس سے محبت کر کے مجھے انفلوئنزا میں مبتلا ہونا ہے!"

"تو پھر اس کے گھر کیوں جا رہے ہو؟" شاہد نے پوچھا۔

"بات یہ ہے۔" جمیل مسکرایا "۔کہ کل غزالہ نے بتایا تھا کہ آج اس نے اپنی ایک سہیلی عذرا کو سہ پہر کی چائے پر بلایا ہے اور مجھے اس سے ملانا چاہتی ہے۔"

"لعنت ہے جمیل تم پر" شاہد نے غصے سے کہا "بدمعاشی کی حد کر دی ہے۔ غزالہ کے ہی گھر میں خود اس کی سہیلی پر نیت خراب کر رہے ہو۔"

"ارے یار، بات تو سنا کرو پوری" جمیل نے برا مانے بغیر کہا "محض ایک نئی لڑکی کی بات ہوتی تو میں کہتا چلو جانے دو، کہیں اور مل جائے گی مگر جانتے ہو عذرا ڈاکٹر عزیز الحق کی اکلوتی بیٹی ہے۔"

"تو یہ بات ہے؟" شاہد چلتے چلتے رک گیا "اسی وجہ سے اسٹور کیپر کی ملازمت کے بارے میں دعویٰ کر رہے تھے کہ تمہارے نام الاٹ ہو چکی ہے۔"

"اب تم جو چاہو سمجھ لو" جمیل نے جیسے بڑے انکسار سے کہا۔

"میں نے ابھی اس لڑکی کو دیکھا نہیں ہے مگر ڈاکٹر صاحب کو دیکھ چکا ہوں اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر تم نے عذرا کو دوسری لڑکیوں پر قیاس کیا تو وہ بے بھاؤ کے جوتے پڑیں گے کہ آنے والی نسلیں بھی گنجی ہی پیدا ہوں گی۔"

"یہ بات ہے تو کچھ شرط لگاتے ہو؟" جمیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ضرور، جتنے کی چاہو" شاہد نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"رقم کی بات مت کرو۔"

"تو پھر؟"

"اگر میں جیت گیا تو تمہیں میری ایک بات ماننا پڑے گی۔"

"کون سی بات؟"

"جو بھی میں کہوں" جمیل بولا "اور تم جیت گئے تو پھر میں تمہاری ایک بات ماننے کا وعدہ کرتا ہوں خواہ وہ کچھ بھی ہو، منظور ہے۔"

"منظور ہے" شاہد نے جمیل کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

جمیل ایک ریسٹورنٹ کی طرف گھوم گیا۔

"یہاں کہاں جا رہے ہو؟" شاہد نے پوچھا۔

"صبح کا ناشتا کیے ہوئے ہوں بھائی! محاذ پر جانے سے پہلے کچھ تازہ دم تو ہو جاؤں"
جمیل نے جواب دیا "اس کے علاوہ تم سے ایک دو غزلیں بھی لکھوانا ہیں۔"

"غزلیں! وہ کس لیے؟"

"سنا ہے عذرا کو شعر و شاعری سے بہت لگاؤ ہے۔"

"ہرگز نہیں" شاہد نے بگڑتے ہوئے کہا "میں اس ذلیل مقصد کے لیے تمہیں اپنا ایک شعر بھی نہیں دے سکتا۔"

"ڈر گئے؟" جمیل نے ایک قہقہہ لگایا۔

"اچھی بات ہے" شاہد نے دانت پیسے "تم جتنی چاہو غزلیں لے لو مگر دیکھ لینا منہ کی کھاؤ گے۔"

دونوں ریسٹورنٹ میں داخل ہو کر ایک خالی میز پر بیٹھ گئے۔ جمیل نے چائے اور اس کے ساتھ کچھ لوازمات کا آرڈر دیا۔ شاہد جیب سے ایک سادہ کاغذ نکال کر اس پر غزلیں لکھنے لگا۔

"مگر غزل میں تو میرا تخلص بھی ہو گا" وہ لکھتے لکھتے بولا "اس کا کرو گے کیا؟"

"تمہیں یاد نہیں رہا کہ میں غزالہ سے شاہد کے نام سے ہی ملا تھا۔ وہ اب تک مجھے شاہد ہی خیال کرتی ہے" جمیل نے جواب دیا۔

○☆○

غزالہ نے ساڑھے چار بجے کا وقت دیا تھا مگر جمیل دانستہ نصف گھنٹے بعد پانچ بجے پہنچا۔

عذرا چار بجے ہی آ گئی تھی۔ ساڑھے چار بجے تک تو غزالہ اس سے اطمینان سے باتیں کرتی رہی مگر جب ساڑھے چار بجتے ہی اس نے مختلف پہلوؤں سے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکنا شروع کر دیا تو عذرا سے نہ رہا گیا۔

"کیا کسی اور سہیلی کو بھی بلایا ہے؟" اس نے پوچھا۔

غزالہ نے اسے جمیل کے بارے میں اب تک کچھ نہیں بتایا تھا۔

"نہیں تو" غزالہ نے ایک مرتبہ پھر کھڑکی سے باہر گیٹ کی طرف جھانکتے ہوئے کہا۔

"تو پھر یہ بار بار کھڑکی سے جھانک جھانک کر کسے دیکھا جا رہا ہے؟"

"ایک ضروری خط کا انتظار ہے" غزالہ نے بہانہ بنایا "ڈاکیہ عموماً اسی وقت آتا ہے اور گیٹ سے خط پھینک کر چلا جاتا ہے کئی لفافے کارڈ وغیرہ اس طرح گم ہو چکے ہیں۔"

"تو تم اس سے کہتی کیوں نہیں کہ وہ باقاعدہ گھنٹی بجا کر ڈاک اندر دیا کرے۔"

"کئی مرتبہ کہہ کر دیکھا' کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔"



"کیوں' کیا ڈاکیہ نہیں مانتا؟"

"ڈاکیا تو مانتا ہے مگر محکمہ ڈاک نہیں مانتا۔"

"کیا مطلب؟"

"ہر ہفتے ایک نئے ڈاکیے کا تبادلہ کر دیا جاتا ہے" غزالہ نے سوکھے منہ سے بتایا۔

عذرا ہنسنے لگی۔

"بہرحال تم خط کا انتظار کر رہی ہو یا کسی اور کا؟" وہ بولی "مگر میں نے تمہاری دعوت کی وجہ سے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا ہے۔ چنانچہ مجھے لگ رہی ہے بڑے زور کی بھوک۔ اگر پانچ منٹ کے اندر چائے نہیں آئی تو میں وہیں باورچی خانے میں گھس جاؤں گی۔"

"اچھا بس پندرہ منٹ اور رک جاؤ۔" غزالہ خوشامدانہ لہجے میں بولی۔

"یا اللہ کس قیامت کے یہ نامے میرے نام آتے ہیں" عذرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ خط کے بجائے کسی ڈاکیے کا انتظار کیا جا رہا ہو؟"

غزالہ جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اس نے گیٹ سے جمیل کو اندر آتے دیکھ لیا۔

"اچھا بھئی اچھا" وہ کھڑکی سے ہٹتے ہوئے بولی "مجھے نہیں معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے دوائیں کھلا کھلا کر تمہارا ہاضمہ اتنا تیز کر دیا ہے۔"

"میں حاضر ہو سکتا ہوں؟" جمیل نے دروازے سے آواز دی۔

عذرا دروازے کی طرف پشت کیے بیٹھی تھی۔ خلاف توقع ایک مردانہ آواز سن کر چونک سی گئی۔ گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا اور جمیل کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بجلی کوند گئی ہو۔ ڈاکٹر عزیز الحق کوئی ایسے خوب صورت آدمی نہیں تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ عذرا

ہوگی کوئی معمولی سی لڑکی۔ مگر یہ دلفریب چہرہ تو لڑکی کے بجائے کسی آسمانی حور کا معلوم ہوتا تھا اور اس وقت جمیل کو نہ جانے کیوں فوزیہ کا خیال آیا۔ وہ فیروزی ساری والی کامنی سی لڑکی جو دو مرتبہ ذرا ذرا سی دیر کے لیے اس کے سامنے آئی تھی مگر اس کے دل ودماغ کو جھنجوڑتی ہوئی چلتی بنی تھی۔

"آپ کو معلوم ہے شاہد صاحب!" غزالہ نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "۔۔کہ آپ پورے نصف گھنٹہ لیٹ آئے ہیں۔"

"مجھے اب تک کسی ایسے گھنٹے کا تجربہ نہیں ہوا جو بہ یک وقت پورا بھی ہو اور نصف بھی" جمیل نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا "مگر آپ کی بدولت بڑی عجیب وغریب چیزوں سے متعارف ہوتا جارہا ہوں۔ بہرحال جہاں تک تاخیر سے آنے کا تعلق ہے' میں شرمندہ ہوں کہ مجھے واقعی کچھ دیر ہوگئی۔ اب اگر آپ یہ فرمائیں کہ ہوئی کیوں تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا تو یہ حقیقت ہے کہ میں تو آتا تھا مگر کوئی عناں گیر بھی تھا۔ یہاں کوئی سے آپ کچھ اور مراد نہ لیں میرا مطلب اپنے دوست جمیل صاحب سے ہے۔ جو سخن فہم تو خیر واجبی سے ہیں مگر غالب کی طرف داری بڑے زور وشور سے کرتے ہیں چنانچہ آج بھی ان کے یہاں ایک محفل شعروسخن آراستہ تھی اور اس ناچیز کی غزلیں اتنی پسند کی گئیں کہ مکرر کی فرمائشوں نے پونے پانچ بجادیئے بڑی مشکل سے جان چھڑا کر بھاگم بھاگ پانچ بجے تک آپ کی خدمت میں حاضر ہوسکا ہوں۔"

عذرا ہی نہیں غزالہ بھی حیرت سے جمیل کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"میں تو آپ کو عذرا سے متعارف کرانا چاہتی تھی" آخر غزالہ نے کہا "مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے خود ہی تعارف حاصل کرنا پڑے گا۔"

وہ عذرا کی طرف گھومی۔

"عذرا بہن یہ ہیں شاہد صاحب! ابو کے ہونہار شاگرد جنہوں نے اس سال بی ایس سی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے سائنس کے طالب علم ہونے کے باوجود بڑی دلچسپ اور بامحاورہ باتیں کرتے ہیں مگر قسم لے لو مجھ سے جو آج سے پہلے کبھی شبہ بھی ہوا ہو کہ یہ محترم شاعر بھی ہیں۔"

"اور میں اسے سراسر تمہاری ناتجربہ کاری پر محمول کروں گی" عذرا نے قدرے رکھائی سے جواب دیا "تمہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ مردم شماری کی تازہ رپورٹ کے مطابق قوم کا ہر تیسرا نوجوان شاعر ہے۔ خاص طور سے وہ نوجوان جنہیں لڑکیوں کے قرب کی سعادت حاصل ہو' سوفیصد شاعر ہوتے ہیں۔"

"محترمہ میں اس خیال میں تھوڑی سی ترمیم کی جسارت کروں گا" جمیل نے مسکراتے ہوئے کہا "اور وہ یہ کہ محض "لڑکیوں" کہنا کافی نہیں ہے بلکہ یوں کہئے کہ جنہیں حسین لڑکیوں کے قرب کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس سے قطع نظر کہ آپ کا یہ خیال شعرا کی تضحیک ہے یا تعریف' آپ نے یہ غور نہیں کیا کہ یہ خیال ظاہر کرکے آپ نے اپنے آپ کو براہ راست اس فراوانی کا ذمے دار قرار دے دیا ہے۔ چنانچہ اگر یہ تعریف ہے تو آپ کی صنف پوری قوم کے شکریہ کی مستحق ہے اور اگر تضحیک ہے تو اس حادثے پر مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے۔"

عذرا کا منہ بن گیا مگر غزالہ ہنسنے لگی۔

"کمال ہے" وہ ہنستے ہوئے بولی "آپ دونوں نے تعارف تو مکمل ہونے دیا ہوتا بہرحال شاہد صاحب' یہ میری بہترین سہیلی اور ڈاکٹر عزیز الحق صاحب کی لاڈلی بیٹی عذرا ہے۔ شعروشاعری کی بے حد دلدادہ ہے اور اسی بنا پر مجھے حیرت ہے کہ اس نے آپ کے شاعر ہونے کی اطلاع پر خوش ہونے کے بجائے لڑنا کیوں شروع کردیا۔"

"اگر یہ غصہ عادتاً نہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کی وجہ بھوک بھی ہوسکتی ہے" جمیل نے شوخی سے کہا "یہ بات متفق علیہ ہے کہ آپ سموسے اور پڈنگ دونوں بہترین تیار کرتی ہیں۔ ممکن ہے کہ میری طرح عذرا صاحبہ نے بھی دوپہر کا کھانا نہ کھایا ہو چنانچہ پہلے آپ چائے پلائیں باقی باتیں اس کے بعد ہوں گی۔"

"آپ نے بالکل سچ کہا" غزالہ نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا "میں اس تشخیص کی تائید کرتی ہوں اور مزید لڑائی جھگڑے کے امکانات ختم کرنے کے لیے گزارش کروں گی کہ آپ دونوں برابر کے کمرے میں تشریف لے چلیں جہاں چائے اور اس کے ساتھ دوسرے لوازمات بھی مہمان نوازی کے لیے بالکل تیار ہیں۔"

چائے کے دوران کچھ زیادہ باتیں نہیں ہوئیں اور جو کچھ ہوئیں ان کا موضوع بھی ذاتیات سے غیر متعلق رہا۔

جمیل یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ عذرا کی موجودگی کو بھی نظرانداز کرنے کے لیے تیار ہے کجا یہ کہ وہ اس کے خشک طرز عمل کو محسوس کرے۔

غزالہ جس کی ابتدا سے یہی کوشش تھی کہ عذرا نہ صرف اس کے حسن انتخاب کی داد دے بلکہ ممکن ہو تو مبتلائے رشک بھی ہو جائے۔ بار بار ایسے موضوعات چھیڑ رہی تھی جس میں جمیل کو اپنی بذلہ سنجی دکھانے کا موقع ملتا رہے چنانچہ چائے سے فارغ ہو کر جب ایک مرتبہ پھر تینوں پہلے کمرے میں واپس آئے تو اس نے جمیل سے کہا۔

"شاہد صاحب! اب اگر میں آپ سے اپنا تازہ کلام سنانے کی فرمائش کروں تو آپ کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔"

"انکار!" عذرا نے کسی قدر طنزیہ لہجے میں کہا "شاہد صاحب تو نہ جانے کتنی دیر سے اس انتظار میں تھے کہ تم کب ان سے کلام سننے کی فرمائش کرتی ہو۔"

"کیا بات ہے آج تمہیں شاعری سے اتنی بوریت کیوں ہو رہی ہے؟" غزالہ نے پوچھا۔

"میں شعر و شاعری کی دلدادہ ضرور ہوں مگر ضروری تو نہیں کہ ہر شخص جسے شاعر ہونے کا دعویٰ ہو اچھے شعر بھی کہہ لیتا ہو۔"

"اس کا فیصلہ تم سنے بغیر کیسے کر سکتی ہو؟"

"اندازہ تو لگا سکتی ہوں کہ ایک سائنس کے طالب علم کی پرواز تخیل کہاں تک ہو گی؟"

"جی ہاں' بالکل اسی طرح جس طرح میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ ایک ڈاکٹر کی بیٹی کا ذوق شاعری کس معیار کا ہو سکتا ہے۔" جمیل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ غزالہ سے مخاطب ہوا۔ "بہرحال غزالہ صاحبہ' میں نے کبھی دوسروں کی پسندیدگی کے خیال سے شعر نہیں کہے۔ آپ نے فرمائش کی ہے اس لیے چند اشعار پیش کرتا ہوں اس توقع کے ساتھ کہ آپ کو پسند آئیں یا نہ آئیں مگر عذرا صاحبہ کو خدا نہ کرے کہ پسند

آئیں ورنہ مجھے شاعری چھوڑنے کے بارے میں غور کرنا پڑے گا۔"

"ارشاد" غزالہ جلدی سے بولی۔

"عرض کرتا ہوں" جمیل نے کہا اور پھر ترنم سے پڑھنے لگا۔

پھولوں کی طرح ہے کبھی خاروں کی طرح ہے
دنیا ترے مبہم سے اشاروں کی طرح ہے
شاید کبھی طوفان ہمیں پار لگا دے
موجوں کا ہر انداز کناروں کی طرح ہے

عذرا نے بے اختیار چونک کر جمیل کی طرف دیکھا۔ غزالہ نے دل کھول کر داد دی۔ جمیل بڑے دلاویز لہجے میں پڑھ رہا تھا۔

آوارہ ہے تاریک خلاؤں میں ازل سے
یہ چاند بھی ہم عشق کے ماروں کی طرح ہے
اک کاہ کشاں ہے میری یادوں کا تسلسل
ہر زخم مرا چاند ستاروں کی طرح ہے

عذرا کی پیشانی کے تمام بل' چہرے کے تمام ناگوار تاثرات' حیرت و دلچسپی میں بدل گئے تھے۔ وہ بڑی محویت سے سن رہی تھی اور غزالہ کا تو یہ حال تھا کہ ہر نیا شعر اس کے چہرے کی سرخی میں اضافہ کرتا جا رہا تھا۔

بے وجہ تو داغوں کی جلن بڑھ نہیں سکتی
موسم میں کوئی چیز بہاروں کی طرح ہے

جمیل جیسے خود ہی اشعار کے تاثرات میں ڈوبا جا رہا تھا۔

افشاں ہے تیری مانگ کی یا اشک ہمارے
آنچل میں کوئی چیز ستاروں کی طرح ہے

اور تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے عذرا کے منہ سے بے ساختہ واہ واہ نکل گئی۔

جمیل نے مقطع پڑھا۔

پھر کوئی ستم ٹوٹنے والا نہ ہو شاہد

ہر شخص ترے شہر میں یاروں کی طرح ہے

جمیل نے غزل ختم کر کے شوخ نظروں سے عذرا کی طرف دیکھا۔

"میں اس شرمندگی کا اظہار الفاظ میں نہیں کر سکتی شاہد صاحب!" عذرا بڑے سنجیدہ لہجے میں بولی "۔۔۔جو اس وقت اپنے دل میں محسوس کر رہی ہوں مگر اس کے باوجود آپ کی اعلیٰ ظرفی سے امید کرتی ہوں کہ آپ مجھے معاف کر دیں گے۔ واقعی آپ بڑے حسین شعر کہتے ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ کہ مجھے شاعری سچ مچ چھوڑنا پڑے گی۔" جمیل نے شرارت سے کہا۔ "جی نہیں' اس کا مطلب یہ ہے کہ اب آپ ایک غزل میری فرمائش پر سنائیں گے۔" عذرا بھی مسکرانے لگی۔

"اسی لیے بزرگوں نے کہا ہے کہ انسان کو اپنی رائے کے اظہار میں محتاط رہنا چاہیے" غزالہ نے کہا۔

"اچھا اماں بی' آپ خاموش رہیں اور شاہد صاحب کو دوسری غزل سنانے دیں۔"

جمیل پہلے ہی گنگنانے لگا تھا۔

رنگ محفل کبھی ہنگامہ محفل ٹھہرے

تم نے جو سمجھا ہمیں ہم اسی قابل ٹھہرے

بڑھ گئی راہ وفا میں جہاں دل کی دھڑکن

وہ مقامات میرے پیار کی منزل ٹھہرے

"بہت خوب" عذرا نے داد دی۔

"آداب عرض کرتا ہوں" جمیل نے جھک کر سلام کیا "ملاحظہ فرمایئے شاید کسی قابل ہو۔"

حادثے ایسے کہاں گزرے تھے طوفانوں پر

جب اٹھے موج تلاطم کوئی ساحل ٹھہرے

"ایک اچھا خیال بڑے سلیقے سے نظم کیا ہے آپ نے" غزالہ نے جوش کے ساتھ

کہا۔

جمیل نے عذرا کی طرف بڑی عجیب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اگلا شعر پڑھا۔

ہم اجالوں کے لیے دھوپ کی مانند جلے

چاندنی بن کے اندھیروں کے مقابل ٹھہرے

چند آنسو کہ تھیں پلکیں بھی گریزاں جن سے

بہہ گئے جب تو تمناؤں کا حاصل ٹھہرے

عذرا نے بڑے والہانہ انداز میں داد دی۔ اس وقت وہ کوئی دوسری ہی عذرا معلوم ہو رہی تھی۔ جمیل کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ بظاہر خشک و سرد مزاج عذرا اتنی جذباتی بھی ہو سکتی ہے۔

وہ کئی کئی بار ایک ایک شعر کو دہرا رہی تھی۔

جمیل نے خاص طور پر اسے مخاطب کرتے ہوئے مقطع پڑھا۔

چاند تارے بھی میری راہ میں آئے شاہد

دل کی منزل تو وہی ہے کہ جہاں دل ٹھہرے

"تعجب ہے" داد کا ہنگامہ ختم ہونے پر عذرا بولی "کہ آپ اتنے اچھے شعر کہتے ہیں مگر میں نے آج تک آپ کو کسی مشاعرے میں نہیں دیکھا؟"

"میں نے ابھی کہا تھا نا کہ میں صرف اپنے لیے کہتا ہوں" جمیل نے جواب دیا "اس لیے داد کی خواہش ہے نہ شہرت کی تمنا پھر مشاعروں میں جانے سے حاصل؟"

"لیکن اب آپ باقاعدہ مشاعروں میں شریک ہوا کریں گے" عذرا نے اس طرح کہا جیسے اسے ایک دم سے جمیل پر بڑا اختیار حاصل ہو گیا تھا "یہ تو ایک ظلم ہے کہ ادب کو اتنی اچھی تخلیقات سے محروم رکھا جائے۔ آئندہ ہفتے انجمن خواتین کی جانب سے ایک مشاعرہ ہو رہا ہے آپ کو اس میں چلنا پڑے گا۔"

"اب یہ تو بڑی زیادتی ہے صاحب۔۔۔" جمیل نے کہنا شروع کیا۔

"تو آخر آپ جاتے کیوں نہیں مشاعروں میں؟" غزالہ نے بھی تائید کی۔ "جب قدرت نے ایک صلاحیت دی ہے تو اس سے خود فائدہ اٹھانا یا دوسروں کو مستفید کرنا بری

بات تو نہیں۔"

"اچھا صاحب، آپ لوگوں نے مشترکہ محاذ بنالیا ہے تو مجھے ہتھیار ڈالنا ہی پڑیں گے"
جمیل نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

"ہرا!" عذرا نے تالی بجائی اور غزالہ کی طرف دیکھ کر بولی۔ "اسی بات پر محفل برخاست ہونے سے پہلے چائے کا ایک دور ہو جائے اور۔۔۔"

"ابھی لائی" غزالہ نے اٹھ کر دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے کہا۔

"آپ نے مجھے معاف کر دیا نا؟" عذرا نے غزالہ کے جاتے ہی آہستہ سے پوچھا۔

"ارے کمال کرتی ہیں آپ کوئی بات بھی ہو۔"

"اگر کوئی بات نہیں ہے تو پھر کل میرے غریب خانے پر تشریف لا رہے ہیں؟"

"مگر۔۔۔"

"انکار کا مطلب میں یہی سمجھوں گی کہ آپ نے مجھے دل سے معاف نہیں کیا" عذرا نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"جیسی آپ کی مرضی۔ حاضر ہو جاؤں گا۔"

"شکریہ!" عذرا خوش ہو کر بولی۔

اچانک بیرونی دروازے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ جمیل نے چونک کر دیکھا تو پروفیسر صاحب داخل ہو رہے تھے۔

مگر کمرے میں قدم رکھتے ہی وہ جمیل اور عذرا کو بیٹھے دیکھ کر وہیں رک گئے پہلے ان دونوں کو بڑے غور سے دیکھا پھر کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔

"السلام علیکم، پروفیسر صاحب!" جمیل نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام" پروفیسر صاحب نے جواب دیا "صاحب زادے، تم بتا سکتے ہو کہ پروفیسر وحید الدین صاحب کا بنگلہ یہی ہے؟"

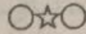
"جی ہاں یہی ہے" جمیل نے ہنستے ہوئے کہا "آپ بالکل صحیح جگہ تشریف لائے ہیں۔"

"تعجب ہے!" پروفیسر صاحب سر کھجاتے ہوئے بولے۔ "غزالہ بیٹی نے مجھ سے

مشورہ کئے بغیر ہی بنگلہ کرائے پر اٹھا دیا ہے۔ اسے کم سے کم بتانا تو چاہیے تھا۔ کہاں ہے وہ؟"

اور یہ کہتے ہوئے وہ اندرونی دروازے کی طرف گھوم کر دوسرے کمرے میں غائب ہو گئے۔

جمیل نے عذرا کی طرف دیکھا اور عذرا جو اب تک بڑی مشکل سے ہنسی روکے بیٹھی تھی، بے اختیار قہقہے لگانے لگی۔



دوسرے دن کی شام جمیل کو ڈاکٹر عزیز الحق کی کوٹھی کے لان میں دیکھ رہی تھی۔ عذرا نے چائے کا اہتمام کمرے میں کرنے کے بجائے لان میں کیا تھا۔

"لوگ کہتے ہیں۔۔۔" عذرا نے چائے کی پیالی بنا کر جمیل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "کہ آدمی اچھے شعر شراب یا محبت کے بغیر نہیں کہہ سکتا۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں چونکہ باقاعدہ اور مستند شاعر نہیں ہوں اس لیے ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا" جمیل نے کہا۔

"مگر شعر تو کہتے ہیں اور جتنا کچھ میں سن چکی ہوں، اس کی بنا پر کہہ سکتی ہوں کہ اچھے اچھے شاعروں سے بہتر کہتے ہیں۔"

"اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتی ہیں کہ میں شراب تو نہیں پیتا۔" جمیل ہنستے ہوئے بولا "تو مجھے افسوس ہے کہ میں اس نعمت سے محروم ہوں۔"

"خدا کا شکر ہے" عذرا نے کہا "مگر یہ تو میرے سوال کے ایک ہی حصے کا جواب ہوا۔"

"محبت کی تالی ایک ہاتھ سے کہاں بجا کرتی ہے عذرا صاحبہ!" جمیل نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

"اس سے پہلے کہ ہماری گفتگو آگے بڑھے میں آپ سے ایک گزارش کروں گی۔"

"وہ کیا؟"

"یہ کہ آپ مجھے عذرا صاحبہ نہ کہا کریں۔"

"تو پھر؟"

"آپ صرف عذرا ابھی تو کہہ سکتے ہیں۔"

"مگر یہ تو گستاخی ہوگی جبکہ میں آپ کا بہت احترام کرتا ہوں۔"

"اگر یہ گستاخی ہے تو یقین کریں میں بالکل برا نہیں مانوں گی۔"

"گویا مجھے آپ کے حضور گستاخیاں کرنے کی اجازت ہے؟"

"ہاں تو آپ کہہ رہے تھے..." عذرا نے کچھ جھینپ کر جلدی سے موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا "کہ محبت کی تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجا کرتی؟"

"ظاہر ہے" جمیل نے پھلوں کی پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"دوسرے الفاظ میں آپ کی زندگی میں ابھی تک کوئی ایسی ہستی نہیں آئی جس سے آپ محبت کر سکیں؟"

"اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ابھی تک میں کسی ایسی ہستی سے نہیں ملا جو مجھ سے محبت کر سکے" جمیل نے کہا اور پھر ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بولا "دیکھئے نا مجھ جیسے بے ہنگم و بے مصرف آدمی سے محبت کرے گا بھی کون؟ آج کل تو محبت بھی بینک بیلنس دیکھ کر کی جاتی ہے۔"

"مجھے آپ سے اختلاف ہے" عذرا نے جواب دیا "دنیا میں مال و دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔"

"ممکن ہے مگر میں نے ابھی تک کسی کو نہیں دیکھا جس کا طرزِ عمل اس کے برعکس ہو۔"

"یہ آپ کی نظروں کی کوتاہی بھی تو ہو سکتی ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ کوئی ہے جو مجھ سے محبت کے لیے محبت کرتا ہے؟" جمیل نے عذرا کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا جواب مجھ سے معلوم کرنے کے بجائے آپ خود ہی تلاش کریں تو زیادہ بہتر ہے" عذرا نے دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے کہا اور پھر جیسے چونک کر بولی "ارے آپ

کچھ کھا نہیں رہے ہیں۔"

"یہ آپ کی نظروں کی کوتاہی بھی تو ہو سکتی ہے" جمیل نے عذرا کا جواب دہرایا۔

دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔

"دیکھئے باتوں باتوں میں ایک ضروری بات تو بھولے ہی جا رہا تھا" جمیل نے ایک دم چونکتے ہوئے کہا۔

"کون سی بات؟" عذرا نے پوچھا۔

"پہلے یہ بتائیے کہ ڈاکٹر صاحب آپ کی بات کس حد تک مانتے ہیں۔"

"آپ کو معلوم ہونا چاہیے جناب کہ میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں" عذرا کچھ تن کر بولی۔

"بہت خوب!" جمیل نے مسکرا کر کہا "گویا میں یقین کر لوں کہ اگر میں کوئی درخواست کروں تو آپ اسے ڈاکٹر صاحب سے منظور کرا لیں گی؟"

"آپ کچھ کہہ کر دیکھئے تو سہی۔"

"یہ تو آپ نے اس طرح کہا جیسے بات منہ سے نکالتے ہی میری مرمت ہو جائے گی۔"

"بڑے شریر ہیں آپ" عذرا محجوب سی ہو گئی۔

"بہرحال میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ ابھی کل پرسوں ڈاکٹر صاحب کے اسپتال میں ایک اسٹور کیپر کی جگہ کے لیے اشتہار دیا گیا تھا۔"

"جی ہاں، مجھے معلوم ہے۔"

"میرے ایک دوست ہیں جمیل صاحب، انہوں نے اس پوسٹ کے لیے اپلائی کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ڈاکٹر صاحب سے سفارش کر کے ان کا تقرر کرا دیں۔"

"میں سمجھ رہی تھی کہ آپ اپنے لیے کہیں گے۔" عذرا نے کچھ تعجب سے کہا "آپ بھی تو شاید بی ایس سی کرنے کے بعد ابھی بیکار ہی ہیں یا پھر آگے تعلیم جاری رکھنے کا خیال ہے؟"

"جہاں تک میرا سوال ہے، ملازمت کی جستجو میں تو میں بھی ہوں" جمیل نے جواب دیا

"مگر آپ اسے میری کمزوری کہہ لیں یا کچھ اور، میں اپنے بارے میں سوچنے سے پہلے اپنے دوستوں کے بارے میں سوچتا ہوں۔ اگر میری کوشش سے میرے کسی دوست کی ضرورت پوری ہو جائے تو مجھے اتنی ہی مسرت ہوتی ہے جتنی اپنی کسی خواہش کے پوری ہونے پر۔"

"واقعی آپ بڑے بلند کردار نوجوان ہیں" عذرا نے تعریف کی "آج کل دنیا میں اتنا بے لوث ہو کر کون سوچتا ہے۔ ویسے میں چاہتی تھی کہ یہ جگہ آپ کو مل جائے تو اچھا ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"دیکھیے نا اسپتال ہماری کوٹھی سے بالکل قریب ہے۔ آپ وہاں تک آتے تو مجھے امید ہوتی کہ بھولے بھٹکے یہاں بھی آنکلیں گے اور اس طرح آپ کا کلام سننے کے زیادہ مواقع ملتے رہیں گے۔"

"اگر صرف اتنی سی بات ہے تو آپ جب چاہیں مجھے کان سے پکڑ کر بلا سکتی ہیں۔ میں حاضر ہو جایا کروں گا۔"

"گویا آپ خود سے کبھی نہیں آئیں گے؟"

"بسروچشم۔ مگر آپ بات ٹال رہی ہیں" جمیل نے کہا۔

"اگر آپ اسی پر مصر ہیں تو جائیے اپنے دوست کو اطمینان دلا سکتے ہیں کہ ان کا اپائنٹمنٹ ہو گیا" عذرا نے جواب دیا۔

"شکریہ!" جمیل نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے آپ کہاں چل دیئے؟" عذرا نے چونک کر پوچھا۔

"اپنے دوست کو اطمینان دلانے کے لیے" جمیل نے فوراً کہا "آپ نے ابھی کہا تھا کہ جائیے۔"

"اُفوہ شاعروں سے تو بات کرنا ہی مشکل ہے، زبان پکڑ لیتے ہیں۔"

"پھر آپ جسے کہیں اسے پکڑا کروں" جمیل نے ہنس کر کہا۔

"گویا آپ سارے کام مجھ سے پوچھ پوچھ کر ہی تو کرتے ہیں؟"

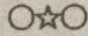
"کوشش تو یہی کر رہا ہوں" جمیل مسکرایا پھر فوراً ہی کہنے لگا "مذاق برطرف اب

اجازت دیجیے کچھ ضروری کام بھی ہے۔"

"پھر کب آیئے گا؟"

"میرا خیال ہے کہ اب ہفتے کو مشاعرے میں ہی ملاقات ہوگی۔ اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ" عذرا نے جواب دیا اور جب تک جمیل گیٹ سے نکل نہیں گیا اسے دیکھتی رہی۔



ڈاکٹر عزیز الحق صاحب رات کے کھانے سے فارغ ہو کر بستر پر لیٹے ہوئے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے کہ عذرا کمرے میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے کل تین بچے تھے۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ بیوی کا انتقال آخری بچے کی پیدائش سے ایک ہی سال کے اندر ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہر چند دوست احباب نے زور دیا مگر ڈاکٹر صاحب نے دوسری شادی نہیں کی۔

بڑا لڑکا انگلینڈ میں ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔ اس کے بعد عذرا کا نمبر تھا اور عذرا کے بعد ایک سات آٹھ سال کی عمر کا لڑکا طارق تھا۔ اکلوتی لڑکی ہونے کی وجہ سے عذرا کی نازبرداریاں کچھ زیادہ تھیں اور ڈاکٹر صاحب اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔

"اب آپ رات کے وقت بھی یہ موٹی موٹی کتابیں پڑھیں گے تو آرام کس وقت کریں گے؟" عذرا نے ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ سے کتاب لے لی۔

ڈاکٹر صاحب نے چشمہ اتار کر غور سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ مسکرائے "چیک بک میز کی دراز میں رکھی ہے" انہوں نے کہا "جتنی رقم کی ضرورت ہو بھر لو میں دستخط کر دوں گا۔"

"ہوں!" عذرا ٹھنکی "آپ سمجھتے ہیں کہ میں اپنے کسی کام کے بغیر آپ کے پاس نہیں آسکتی؟"

"آ تو سکتی ہو مگر میرے آرام کا خیال تمہیں عموماً اس وقت آتا ہے جب کچھ پیسوں کی ضرورت ہو" ڈاکٹر صاحب نے چھیڑا۔

"جب آپ خود ہی آرام سے بھاگتے ہوں تو کوئی کہاں تک خیال رکھ سکتا ہے" عذرا

نے مصنوعی غصے سے کہا "کتنی مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ اسپتال کے انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لیے کسی منیجر کو رکھ لیجیے مگر آپ نے ہر طرف سے اپنے آپ کو باندھ رکھا ہے پھر یہ کہ دن ہو یا رات جس وقت جس کا دل چاہتا ہے پکڑ کر لے جاتا ہے۔ کم سے کم اتنا تو کر ہی سکتے ہیں کہ رات کے لیے کسی ڈاکٹر کی ڈیوٹی لگا دیں۔"

"اچھا بھئی اچھا مان لیا کہ ہماری بیٹی کو ہمارا خیال ہے" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "اب تم اپنا کام بتاؤ اور مجھے پڑھنے دو۔ ایک ضروری کیس کے سلسلے میں کچھ پوائنٹس نوٹ کرنا ہیں۔"

"آپ نے اسٹور کیپر کی جگہ کے لیے کسی کو رکھ لیا؟" عذرا فوراً...... مطلب پر آگئی۔

"گویا ہماری بیٹی گھر کے انتظامات سے آگے بڑھ کر اسپتال کے معاملات میں بھی دلچسپی لینے لگی ہے" ڈاکٹر صاحب نے کچھ چونک کر کہا۔

"کیا آپ سے متعلق ہر معاملے میں دلچسپی لینا میرا فرض نہیں ہے؟"

"ضرور ہے بھئی مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیجئے۔"

"ابھی تک تو نہیں رکھا ہے مگر قریب قریب ارادہ کر لیا ہے۔"

"تو پھر آپ اس تقرر کا اختیار مجھے دے دیجئے' میں کل آفس جا کر جسے مناسب سمجھوں گی' رکھ لوں گی۔"

"مگر بیٹی انٹرویو تو میں نے لیے ہیں' تمہیں کیسے معلوم ہو گا کہ کون سا امیدوار اس جگہ کے لیے موزوں ہے؟"

"مجھے انٹرویو لینے کی ضرورت نہیں ہے" عذرا نے جواب دیا۔

"گویا تم پہلے سے کسی کو وہ جگہ دینے کا ارادہ کر چکی ہو؟"

"جی ہاں۔"

"کون ہے وہ۔"

"جمیل احمد صاحب" عذرا نے بتایا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے درخواست دی

ہے۔"

"کیا!" ڈاکٹر صاحب بے اختیار چونک کر عذرا کو دیکھنے لگے "جمیل۔ تمہارا مطلب ہے وہ بی اے فیل۔ تم اسے کیسے جانتی ہو؟"

"میں انہیں نہیں جانتی۔"

"پھر تمہیں کیسے معلوم کہ وہ اس جگہ کا اہل ہے یا نہیں؟"

"جن صاحب نے مجھ سے جمیل کی سفارش کی ہے وہ کسی غیر اہل امیدوار کے لیے کہہ ہی نہیں سکتے تھے۔"

"کس نے سفارش کی ہے؟"

"شاہد صاحب نے" عذرا نے بتایا "وہ بڑے اچھے شاعر اور اس سے زیادہ اچھے انسان ہیں' میں انہیں بخوبی جانتی ہوں۔"

"تمہارا مطلب اس شاہد سے تو نہیں جو اسلامیہ کالج کا اسٹوڈنٹ تھا اور اسی سال بی ایس سی امتیازی نمبروں سے پاس کیا ہے۔"

"جی ہاں۔"

"مگر وہ تو خود اس جگہ کا امیدوار ہے" ڈاکٹر صاحب نے حیرت سے کہا "میں اس کا انٹرویو لے چکا ہوں۔"

ایک لمحے کے لیے عذرا حیرت زدہ رہ گئی' وہ سوچ رہی تھی' شاہد نے اسے یہ بات کیوں نہیں بتائی۔ مگر فوراً ہی اس نے اس کی توجیہہ کر ڈالی "آپ اسی سے ان کی شریف طبیعت کا اندازہ لگا سکتے ہیں" وہ بولی "غالباً انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ آپ نے جمیل صاحب کو مسترد کر دیا ہے اور ان کی طبیعت نے گوارا نہیں کیا کہ دوست کی ناکامی کے بعد خود اس جگہ کے امیدوار ہوں۔ وہ مجھ سے اپنے لیے بھی کہہ سکتے تھے مگر انہوں نے دوست کے مفاد کو زیادہ عزیز رکھا۔"

"مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی ہے کہ میں نے انٹرویو میں اس لڑکے کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی وہ ویسا ہی نکلا" ڈاکٹر صاحب سنجیدہ لہجے میں بولے "مگر بیٹی' اس نے دوستی کے جذبے میں ایک غلط آدمی کی سفارش کی ہے۔ جمیل ذہین ہے اور چالاک بھی مگر

مجھے اس کی فطرت میں احساس ذمے داری کا فقدان محسوس ہوا۔ وہ اسٹور کیپر جیسی ذمے دارانہ جگہ کے لیے مناسب نہیں۔"

"مگر میں شاہد صاحب سے وعدہ کر چکی ہوں" عذرا نے ضد کی۔

"ضد نہیں کرتے بیٹے" ڈاکٹر صاحب نے نرم لہجے میں سمجھایا "یہ ایسے معاملات ہیں جن کے بارے میں تم بہتر فیصلہ نہیں کر سکتیں۔"

"تو آپ میری بات نہیں مانیں گے؟" عذرا نے روٹھنے کے انداز میں کہا۔

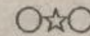
"تم جانتی ہو کہ میں نے تمہاری جا اور بے جا سب ہی ضدیں پوری کی ہیں مگر ان کا تعلق میری یا تمہاری ذات سے تھا۔ میں ایسے معاملے میں تمہارے غلط.... فیصلے کی تائید کیسے کردوں جس کا نقصان دوسروں کو اٹھانا پڑے۔ البتہ اگر تم شاہد کے بارے میں کہتیں تو میں بلا تامل آمادہ ہو جاتا۔"

"گویا آپ پہلے سے شاہد صاحب کو لینے کا فیصلہ کر چکے تھے؟" عذرا نے ایک دبی دبی مسرت کے ساتھ پوچھا۔

"نہیں بالکل فیصلہ تو نہیں کیا تھا دو چار اور اہل امیدوار بھی نگاہ میں تھے۔" ڈاکٹر صاحب نے بتایا "مگر بہرحال یہ بات مانی جاسکتی ہے۔"

"تو پھر آپ یہی بات مان لیجیے اور اس پوسٹ پر شاہد صاحب کا تقرر کر دیجیے۔"

"اچھا بھئی، اچھا۔ اب تم مجھے کتاب دو اور بھاگ جاؤ یہاں سے۔" ڈاکٹر صاحب نے دوبارہ چشمہ لگاتے ہوئے کہا۔



"اب بتایئے جناب!" شاہد اپائنٹمنٹ لیٹر جمیل کی ناک کے آگے نچاتے ہوئے بولا "یہ پوسٹ تو آپ کے بقول آپ کے نام الاٹ ہو چکی تھی۔"

جمیل نے لیٹر پڑھ کر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ "کوئی بات نہیں دوست، ملازمت مجھے ملی یا نہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے یہ تو حساب دوستاں والی بات ہے۔ بہرحال مبارک ہو، مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میرا یوں بھی مستقل ملازمت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر تمہاری بات دوسری ہے۔ تمہارا وہاں کیریئر بن جائے گا۔"

"جی ہاں انگور کھٹے والی بات کر رہے ہو" شاہد ہنسا "بڑے زور شور سے عذرا کو پھانسنے گئے تھے مگر میں نے کہا تھا نا کہ وہاں تمہاری دال نہیں گلے گی۔ دیکھ لو وہی ہوا۔ قاعدے سے شرط ہار چکے ہو اس لیے میری ایک بات ماننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"دال تو ایسی گلے گی بھائی کہ تم منہ دیکھتے رہ جاؤ۔" جمیل لمحہ بھر کی سنجیدگی کے بعد پھر ہنسنے لگا تھا "بس اپنی دو چار اچھی اچھی غزلیں اور دے دینا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ تمہیں اب بھی عذرا کو غزلیں سنانے کا موقع مل جائے گا؟"

"موقع!" جمیل نے ایک قہقہہ لگایا "یار، وہ تو میں نے ہی کچھ ڈور کھینچ رکھی ہے ورنہ عذرا تو یہ چاہتی ہے کہ میں ہر روز دن کا بیشتر حصہ اسے غزلیں ہی سناتا رہوں۔"

"میں نہیں مانتا" شاہد نے بے یقینی کے ساتھ کہا "تم جھوٹی سچی باتیں گھڑنے میں ویسے ہی ماہر ہو مجھے کیا پتا کہ یہ بھی کوئی بے پر کی نہیں اڑا رہے ہو۔"

"بھیا! یہ جو تمہیں نوکری ملی ہے نا یہ بھی ایں جانب ہی کا صدقہ ہے" جمیل بولا "میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ بات کیا ہوئی ہوگی۔ بہرحال اگر تمہیں یقین نہیں تو ہفتے کے دن میرے ساتھ چلنا، سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے۔"

"کیوں، ہفتے کے دن کیا ہے؟" شاہد نے حیرت سے پوچھا۔

"ایک شاندار مشاعرہ جس میں یہ آپ کا خادم محض عذرا کے اصرار پر شریک ہو رہا ہے" جمیل نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بتایا۔



مشاعرہ واقعی شاندار تھا۔ انجمن خواتین بڑے بڑے لوگوں کی بیگمات کا ایک ادارہ تھا۔ جس کا مقصد اگرچہ بیگمات کے لیے پبلسٹی حاصل کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں تھا.... لیکن ظاہرداری کے لیے ایک دو اسکول اور انڈسٹریل ہوم بھی اس کے زیر اہتمام چل رہے تھے۔ مگر بیگمات کی سرگرمیوں کا زیادہ زور آرٹ نمائشوں، رقص و سرود کے مظاہروں اور مینا بازاروں کے انعقاد پر مرکوز رہتا تھا۔ یہ سالانہ مشاعرہ بھی ان سرگرمیوں میں سے ایک تھا اور چونکہ سرکاری سرپرستی حاصل تھی اس لیے ملک گیر پیمانے پر ہوا کرتا تھا۔

ڈاکٹر عزیز الحق کی وجہ سے عذرا بھی انجمن خواتین کی خاصی معروف و مصروف کارکن

تھی۔ صدر، نائب صدر اور سیکریٹریوں کی جملہ اقسام کے عہدے تقسیم ہو چکے تھے اس لیے اسے مجلس عاملہ کا رکن بنا لیا گیا تھا۔ اسی کی کوششوں سے جمیل کو بھی شاہد کے نام سے بحیثیت شاعر شریک ہونے کا دعوت نامہ بھجوا دیا گیا۔ اور یہ بھی اسی کا اثر تھا کہ جب مشاعرہ شروع ہوا تو اسٹیج سیکریٹری نے شاہد یعنی جمیل کو مقامی نو آموزوں کے ساتھ بھگتانے کے بجائے خاصے مشہور شاعروں کی فہرست میں ساتویں آٹھویں نمبر پر رکھا تھا۔

شاہد نے اس موقع کے لیے جمیل کو اپنی تین چار بہترین غزلیں لکھ کر دے دی تھیں جنہیں جمیل نے ترنم کی مختلف دھنوں کے ساتھ پہلے سے کئی مرتبہ ریہرسل کر کے کافی پختہ کر لیا تھا۔ شاہد خود بھی اس کے ساتھ آیا تھا اور چونکہ ایک شاعر کے ساتھ آیا تھا اس لیے اگلی صفوں میں بیٹھنے کا موقع بھی حاصل تھا۔ یہ دونوں مشاعرے کے پنڈال میں پہنچے تو عذرا انہیں باہر ہی بے تابی سے انتظار کرتی ہوئی مل گئی تھی۔ وہ سفید ساری باندھ کر آئی تھی۔

شاہد نے آج اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا اور اگر اس کی فطری شرافت مانع نہ ہوتی تو دل یہ چاہ رہا تھا کہ اسے مسلسل دیکھے ہی جائے۔ جمیل بے شمار لڑکیوں کے ساتھ اپنے رومان کی داستانیں اسے سنا چکا تھا۔ خود شاہد بھی کتنی ہی مرتبہ اس کی اس آوارہ گردی میں بادل ناخواستہ شریک ہونے پر مجبور ہوتا رہا مگر آج...... اس نے پہلی مرتبہ اپنے دل میں ایک کسک محسوس کی اور بے اختیار یہ چاہا کہ کاش جمیل اس عذرا سے نہ ملا ہوتا۔ جمیل نے عذرا سے شاہد کا تعارف کرایا۔

"ان سے ملیے" وہ بولا "یہ ہیں مسٹر جمیل احمد، وہ بی اے فیل امیدوار جن کے لیے آپ نے سفارش کی تھی۔"

شاہد، جمیل کے مقابلے میں کہیں زیادہ وجیہ اور جاذب توجہ شخصیت کا مالک تھا۔ عذرا نے اسے دیکھا اور کچھ مبہوت سی ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے جن الفاظ میں جمیل کا ذکر کیا تھا۔ انہیں سن کر عذرا نے کوئی اچھا تاثر قائم نہیں کیا تھا۔ مگر وہ اس وقت جس جمیل کو اپنے سامنے دیکھ رہی تھی وہ تو کوئی اور ہی معلوم ہوتا تھا۔ جمیل ایک ہی گھاگ تھا۔ نہ جانے کتنی لڑکیوں سے واقف تھا۔ نگاہوں کو پہچانتا تھا۔ ایک دم سے اسے احساس ہوا کہ اگر کہیں عذرا کو معلوم ہو جائے کہ جس کی شاعری پر وہ وارفتہ ہو رہی ہے، وہ شاہد یہی ہے تو

پلٹ کر جمیل کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرے گی۔"

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی" عذرا نے واقعی خوش ہوتے ہوئے کہا "مگر ایک بات ہے نہ جانے کیوں آپ کو دیکھ کر یہ بات سچ معلوم نہیں ہوتی کہ آپ بی اے پاس نہیں کر سکے ہیں۔"

"جی ہاں" جمیل نے بڑی صفائی سے کہا "کچھ لوگ بی ایس سی ہو کر بھی جاہل نظر آتے ہیں جیسے کہ میں اور کچھ لوگ ہر کلاس میں فیل ہوتے ہیں مگر پھر بھی جمیل صاحب کی طرح سند یافتہ دکھائی دیتے ہیں۔"

"ایمانداری کی بات یہی ہے" عذرا نے ایک ہلکے سے قہقہے کے ساتھ جواب دیا "کہ جب غزالہ نے بتایا کہ آپ نے فرسٹ ڈویژن میں بی ایس سی پاس کیا ہے تو مجھے یقین نہیں آیا تھا۔"

"اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی کے بارے میں آپ کا پہلا تاثر بڑا حقیقت آفریں ہوتا ہے۔" شاہد نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

"جی ہاں۔ بہت زیادہ" جمیل نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے تائید کی۔

"اچھا آئیے آپ لوگ چل کر اندر بیٹھئے۔" عذرا نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

شاہد کو چوتھی صف میں جگہ ملی۔ پنڈال پورا بھر چکا تھا مگر اس کے باوجود لوگ برابر چلے آ رہے تھے۔ مشاعرہ وقت مقررہ سے صرف آدھے گھنٹے بعد ہی شروع ہو گیا۔ ابتدا میں بڑی ہوٹنگ ہوئی مگر آہستہ آہستہ رنگ جمتا گیا۔ کافی دنوں بعد ایک سلیقے کا مشاعرہ ہو رہا تھا اور لوگ ٹکٹ لے کر سننے آئے تھے اس لیے شروع کے دو چار شاعروں کے بعد ذرا سنجیدہ ہو گئے۔

تقریباً ساڑھے گیارہ بجے شاہد کا نام پکارا گیا اور جمیل نے اسٹیج پر آ کر اس طرح جیسے زندگی بھر مشاعروں میں کلام ہی سناتا رہا ہے، بڑی شاعرانہ اداکاری سے شاہد کی غزل سنانا شروع کی۔ مطلع نے ہی تہلکہ مچا دیا اور پھر تو ہر ہر شعر پر وہ داد ملی ہے کہ بڑے بڑے جغادری شاعروں کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ لوگ کرسیوں پر سے اچھلے پڑ رہے تھے۔ ایک ایک شعر کئی کئی مرتبہ پڑھوایا جا رہا تھا۔ شاہد نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ داد کا نشہ کیا ہوتا ہے۔

اگرچہ وہ اسٹیج پر موجود نہیں تھا۔ مگر ظاہر تھا کہ غزل اسی کی تھی اور جمیل کو جو داد مل رہی تھی اس کا اصل مخاطب وہی تھا۔

ایک غزل ختم ہوئی تو لوگوں نے "ایک اور" کا شور مچادیا۔ سیکرٹری مشاعرہ نے ایک بڑے شاعر کا نام پکارا مگر لوگ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ شاعر صاحب نے بھی ہوٹ ہونے سے بہتر یہی خیال کیا کہ خود جمیل سے ایک غزل سنانے کی فرمائش کریں۔ چنانچہ جمیل کو ایک غزل اور سنانا پڑی۔ اس کے بعد بھی لوگوں نے اس وعدے پر جاں بخشی کی کہ آخر میں اسے ایک مرتبہ پھر بلایا جائے گا۔ اس کے بعد دوسرے ماہر کلام شعرا کا نمبر تھا اور انہوں نے بہترین غزلیں بھی سنائیں۔ بے تحاشا داد بھی ملی مگر جو رنگ جمیل پیدا کر گیا تھا، وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا۔

تقریباً ایک بجے مشاعرے کی کارروائی اختتام کو پہنچی۔ عذرا اپنی کار میں آئی تھی۔ اس نے جمیل اور شاہد دونوں کو ان کے گھر چھوڑنے کی پیش کش کی اور تمام راستے کار ڈرائیو کرتے ہوئے اس کی زبان پر شاہد کی غزلوں کا ہی ذکر رہا۔ شاہد کا گھر پہلے پڑتا تھا۔ اسے اتارنے کے بعد جمیل اور عذرا روانہ ہوئے تو عذرا ایک مرتبہ پھر اس کی شاعری پر گفتگو کرنے لگی "میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ اگر آپ دو چار مشاعروں میں بھی شریک ہو جائیں تو لوگ آپ کو کہیں سے کہیں پہنچا دیں گے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ اپنے آپ کو چھپا کر آپ اپنے مداحوں پر کتنا ظلم کر رہے تھے۔"

مگر سوال یہ ہے کہ ایک دو گھڑی کی واہ واہ سے حاصل بھی کیا ہے؟" جمیل نے کہا "شاعری میرے لیے محض اپنے شوق کی چیز ہے اور میں اسے اسی حد تک رکھنا چاہتا ہوں۔"

"مگر میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گی" عذرا نے کہا "حیرت ہے" آپ کو ابھی تک اس بات کا اندازہ نہ ہو سکا کہ قدرت نے آپ کو کتنی بے پناہ شعری صلاحیت عطا کی ہے۔ آپ جسے محض اپنے شوق کی چیز کہہ رہے ہیں۔ میں اسے اپنے تصور میں عنقریب پورے ملک کے گوشے گوشے میں گونجتے محسوس کر رہی ہوں۔ یہ معمولی ملازمت آپ کا مستقبل نہیں ہے۔"

"مگر سوال یہ ہے کہ خود آپ کے بقول میں ابھی سرے سے شاعر ہی نہیں ہوں تو آپ مجھے مستقبل کے یہ سہانے خواب کیوں دکھا رہی ہیں؟"

"آپ ابھی تک غزالہ کے یہاں میرے برتاؤ کو نہیں بھولے ہیں۔" عذرا افسردہ ہو کر بولی۔

"میرا اشارہ اس کی طرف نہیں تھا۔"

"تو پھر؟"

"اس کے دوسرے دن اپنی کوٹھی میں گفتگو کرتے ہوئے آپ نے محبت اور شاعری کو لازمی جزو قرار دیا تھا کہ اس کے بغیر آدمی شاعر ہی نہیں بن سکتا۔"

"یہ میں نے ایک عام بات دہرائی تھی۔ اپنا نظریہ نہیں بیان کیا تھا" عذرا کچھ شرما گئی۔

"مگر شراب نہ سہی، محبت تو واقعی ایک ایسی چیز ہے جو شاعری میں رنگینی اور مٹھاس پیدا کر دیتی ہے" جمیل نے کہا "اگر آپ کے مشورے کے مطابق میں سنجیدگی سے شاعری کی طرف توجہ دوں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں اب محبت کرنے کے لیے کسی کو تلاش کروں؟"

"میرا تو خیال تھا کہ آپ اب تک تلاش کر چکے ہیں۔"

"مگر اس تلاش کا حاصل کیا جسے آدمی اپنا نہ کہہ سکے۔"

"آپ نے سنا نہیں کہنے والے کی زبان کون روک سکتا ہے" عذرا شریر لہجے میں بولی۔

"مگر میں بہت خوددار ہوں عذرا، اپنی بات کھونا نہیں چاہتا" جمیل بڑا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"یہ کس نے کہا کہ آپ اپنی بات کھو دیں گے؟"

"کسی نے یہ بھی تو نہیں کہا کہ میری بات رکھ لی جائے گی۔"

"چلیے تو کسی کی طرف سے میں آپ کو یہ یقین دلا سکتی ہوں" عذرا نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

"سچ عذرا!" جمیل نے ہاتھ بڑھا کر عذرا کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"نہیں جھوٹ۔"

"تو کیا میں اپنی خوش نصیبی پر یقین کر لوں؟" جمیل نے کچھ اور قریب ہونے کی کوشش کی۔

"ضرور۔ مگر میں محبت کو بہت مقدس چیز خیال کرتی ہوں" عذرا نے نرمی سے ہاتھ چھڑا لیے۔

"اس پہیلی کا مطلب کیا ہوا؟" جمیل کو شاید اس رد عمل کی توقع نہیں تھی۔

"محبت کا قانونی اور اخلاقی تحفظ" عذرا نے چہرے پر پھیلی ہوئی سرخی کے ساتھ کہا۔

"تمہارا مطلب ہے شادی؟" جمیل نے جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب مان جائیں گے؟"

"ابا جان' آپ سے بہت متاثر ہیں۔"

"صرف ملازمت کی حد تک۔"

"آپ کہہ کر تو دیکھئے" عذرا بری طرح شرمائی جا رہی تھی۔

"تم کہتی ہو تو قسمت آزمائی کر لوں گا" جمیل بولا "مگر فرض کرو' انہوں نے انکار کر دیا تو؟"

"وہ ایسا نہیں کر سکتے۔"

"لیکن کر دیا تو؟" جمیل نے بڑے معنی خیز لہجے میں کہا "بغاوت کا حوصلہ رکھتی ہو؟"

"اگر اس کا وقت آیا تو آپ مجھے کم ہمت نہیں پائیں گے۔"

"بس میں یہی یقین کرنا چاہتا تھا" جمیل نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ نے سروس جوائن کر لی" اچانک عذرا نے پوچھا۔

"خوب یاد دلایا۔ میں اسی سلسلے میں ایک بات کہنے والا تھا کہ میں نے سروس تو جوائن کر لی ہے مگر آپ مجھ سے ملنے آنے یا مجھے فون کرنے کی زحمت نہ کیجئے گا۔"

"کیوں؟"

"میں اپنی محبت کو افسانہ نہیں بنانا چاہتا" جمیل مسکرا کر بولا "ایک فون یا ایک ملاقات اور پورا اسپتال یہ سوچ رہا ہو گا کہ ڈاکٹر عزیز الحق کی بیٹی اور ایک معمولی اسٹور کیپر

پر اتنی مہربان کیوں ہے' ضرور کوئی بات ہے۔"

○☆○

جمیل نے لڑکیوں سے اپنے تعلقات کو کبھی سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا وہ کہتا تھا کہ لوگوں کو جو مزہ مچھلی کے شکار میں آتا ہے' بالکل وہی مزہ مجھے کسی نئی لڑکی کو پھنسانے میں آتا ہے۔ چارہ ڈال کر کانٹا پھینک دیا اور اب کر رہے ہیں انتظار کہ مچھلی کب کانٹا نگلتی ہے۔ اس نے کانٹا نگلا تو ایک دلچسپ کش مکش شروع ہو گئی۔ شکاری ڈھیل دے رہا ہے۔ مچھلی یہ سمجھ کر بھاگ رہی ہے کہ اب بچ نکلی مگر فوراً ڈور کو جھٹکا لگتا ہے ایک ٹیس سی اٹھتی ہے اور مچھلی سوچتی ہے کہ اگر وہ آزاد ہے تو پھر یہ خلش کیسی ہے اور اسی وقت شکاری ڈور کھینچنا شروع کر دیتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مچھلی ڈور میں بندھی شکاری کی طرف کھنچتی چلی جاتی ہے۔ اچانک پھر تڑپ کر ایک پلٹا کھاتی ہے اور شکاری ڈور ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جب تک کوئی لڑکی اس سے بھاگتی تھی وہ اس کا پیچھا کرتا تھا اور جہاں کسی لڑکی نے کشمکش چھوڑ کر ہتھیار ڈالے اور اس کی دلچسپی ختم۔ ایک دو ملاقاتوں تک اسے گوارا کرتا اور پھر یوں ذہن سے نکال پھینکتا جس طرح کوئی کپڑوں سے گرد جھاڑ دیتا ہے۔ اب تک صرف دو لڑکیاں ایسی ملی تھیں کہ جمیل کو شکار کرنے کے ساتھ ساتھ شکار ہونے کا احساس بھی پیدا ہوا تھا۔ ایک فوزیہ اور دوسری عذرا۔ فوزیہ کے بارے میں تو وہ اب تک ایک بے نام سے احساس شکست میں مبتلا تھا کہ وہ آئی بھی اور نکل بھی گئی مگر عذرا بالکل اس کی مٹھی میں تھی۔ اور جمیل سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اس سے سچ مچ شادی کر ہی لے تو کیا نقصان ہے۔ اس میں شک نہیں کہ احمد علی صاحب کی مالی حیثیت اچھی خاصی تھی لیکن وہ اپنا مستقبل بزازی سے وابستہ نہیں کر سکتا۔ دوسری طرف ڈاکٹر عزیز الحق اتنے بڑے اسپتال کے مالک ہیں اب تک لاکھوں روپے کا تو بینک بیلنس ہو چکا ہو گا۔ اسپتال اور لاکھوں کے بیلنس کو تین حصوں میں تقسیم کیا بھی جائے تب بھی بات لاکھوں میں ہی رہتی ہے۔

مگر پریشانی یہ تھی کہ خود اس کے والدین اس شادی کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتے تھے۔ بالکل پرانے زمانے کے دقیانوسی بزرگوں کی طرح اس کی ماں نے بھی اس کی منگنی بچپن

سے ہی اختیار خان جوتے والوں کی لڑکی سے کردی تھی اور یہ اختیار خاں جوتے والے احمد علی صاحب کے عزیز ترین دوستوں میں شامل تھے جو کسی دوسرے شہر میں جوتوں کا کاروبار کرتے تھے۔ اگر اس نے عذرا سے شادی کرنے کا اشارہ بھی کیا تو گھر میں قیامت برپا ہو سکتی تھی۔ احمد علی صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی بات کے پیچھے اکلوتے بیٹے کو بھی بڑی خوشی سے قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتے۔

پریشانی یہی نہیں تھی کہ جمیل کو صرف اپنے والدین کی طرف سے مخالفت کا اندیشہ ہو۔ اسے یقین تھا کہ کسی جادو کے زور سے وہ احمد علی صاحب کو آمادہ کر بھی لے تو ڈاکٹر عزیز الحق سے قطعی یہ امید نہیں تھی کہ وہ جمیل کو شرف دامادی بخشنے پر تیار ہو جائیں گے۔ تیسری پریشانی خود عذرا کی طرف سے بھی ممکن تھی۔ شاہد کے نام اور اس کی شاعری نے ایسی الجھن پیدا کردی تھی کہ اس کا صاف ہونا خود عذرا کے صاف ہونے کے مترادف بن سکتا تھا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ عذرا کو بھی اس نے اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر کیوں نہیں جیتا اس کے لیے شاہد کا سہارا کیوں لیا مگر ساتھ ہی وہ محسوس کر رہا تھا کہ عذرا ایسی لڑکی نہیں تھی جو کسی اور طرح اس کے قابو میں آسکتی۔ وہ غزالہ کے ہاں اس کا پہلا رد عمل دیکھ چکا تھا اور پھر مشاعرے میں شاہد اور عذرا کی ملاقات کا منظر بھی اس کے ذہن میں چبھ کر رہ گیا تھا۔ نہیں وہ اس بات کی ہمت نہیں کر سکتا کہ عذرا پر اصل حالات کا انکشاف کر کے اسے ہاتھ سے کھونے کا خطرہ مول لے۔ عجیب اتفاق تھا کہ شاہد' عذرا ہی کے معاملے میں اس سے شرط بھی لگا بیٹھا تھا۔ اب عذرا کے ہاتھ سے جانے کا مطلب شرط ہار جانے کی شرمندگی ہی نہیں جمیل کی انا اور اس کے پندار کی شکست تھی اور جمیل شرط ہار جانا تو برداشت کر سکتا تھا مگر شکست تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

کئی دن تک وہ اس مسئلے پر سر کھپاتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے چالاک ذہن نے ایک اسکیم تیار کر ہی لی۔ آپ ہی آپ اس کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ آگئی اور وہ کپڑے تبدیل کر کے گنگناتا ہوا اپنے دوست مشتاق کی طرف چل دیا۔ جس کی دکان پر ریڈیو' ٹیلی وژن اور ٹیپ ریکارڈر وغیرہ فروخت ہوتے تھے۔

○☆○

ڈاکٹر عزیز الحق کے پرائیویٹ آفس کے دروازے پر کھڑے ہوئے چپراسی نے بڑے غور سے لمبی داڑھی والے بڑے میاں کو دیکھا جو ایک ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی کیس اور دوسرے ہاتھ میں ملاقاتی کارڈ پکڑے عینک کے شیشوں کے پیچھے آنکھیں جھپکا رہے تھے۔

"اماں تم آدمی ہو یا چپراسی" بڑے میاں نے کہا "تم سے کہہ رہا ہوں کارڈ لے جاؤ مگر تم سنتے ہی نہیں۔"

"جناب' میں آپ کا کارڈ ڈاکٹر صاحب کو دے آیا ہوں" چپراسی نے جواب دیا "مگر۔۔ وہاں ایک صاحب پہلے سے بیٹھے ہیں' جب تک وہ چلے نہیں جا۔ تے ڈاکٹر صاحب آپ کو کیسے بلا سکتے ہیں۔"

"اماں تو کیا میں ان کے سر پر بیٹھنے جا رہا ہوں" بڑے میاں بگڑے "کوئی صاحب بیٹھے ہیں تو بیٹھے رہیں۔ میں دوسری کرسی پر بیٹھ جاؤں گا۔ وہ بات کر رہے ہیں تو میں اتنا بد تہذیب نہیں کہ ان کی باتوں میں دخل دوں یا پھر تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ڈاکٹر صاحب کے دفتر میں آنے والوں کے بیٹھنے کے لیے صرف ایک ہی کرسی رکھی ہے۔"

"بڑے آدمیوں کا قاعدہ ہوتا ہے کہ جب تک ایک ملاقاتی سے بات نہیں کر لیتے دوسرے کو نہیں بلاتے" چپراسی نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اچھا تو پھر کم سے کم یہ کارڈ ہی دے آؤ۔"

"ایک کارڈ دے تو آیا ہوں۔"

"اماں تو پھر کیا ہوا ایک اور دے آؤ' میرے پاس کوئی کارڈوں کی کمی ہے۔"

چپراسی حیران ہوا کہ ان بڑے میاں کو کیسے سمجھائے۔ وہ کوئی جواب سوچ ہی رہا تھا کہ اندر بیٹھے ہوئے ملاقاتی نے باہر آکر اس کی مشکل آسان کردی۔

"جائیے صاحب!" وہ بولا "یہ دوسرا کارڈ آپ خود ہی جا کر دے دیں۔"

بڑے میاں اٹیچی کیس سنبھالے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے دفتر میں داخل ہوئے۔

"السلام علیکم" انہوں نے دروازے سے ہی نعرہ لگایا۔

"وعلیکم السلام" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا اور کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولے

"بیٹھیے۔"

"اماں بیٹھوں گا نہیں تو اتنی ضروری باتیں کیا کھڑے ہی کھڑے کرتا رہوں گا" بڑے میاں نے کمال بے تکلفی سے اٹیچی کیس اپنے سامنے میز پر رکھا اور خود کرسی پر بیٹھ گئے۔ اٹیچی کیس رکھنے کے لیے میز کی کچھ چیزیں انہیں ایک طرف ہٹانا پڑیں۔

"اسے نیچے رکھ دیں تو بہتر ہے" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

ڈاکٹر صاحب کا مطلب اٹیچی کیس سے تھا مگر بڑے میاں نے پین اسٹینڈ' ایش ٹرے' پیپر ویٹ اور دوسری چیزیں جو انہوں نے سمیٹی تھیں اٹھا کر قریب کی کرسی پر رکھ دیں۔

"اماں ڈاکٹر' آدمی سمجھ دار معلوم ہوتے ہو" وہ بولے "میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔"

"فرمایئے کیسے آنا ہوا۔" ڈاکٹر صاحب نے مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"اماں سیدھا ہوائی جہاز سے چلا آرہا ہوں۔ برخوردار نے تار دے کر بلوایا ہے۔"

"تو برخوردار کہاں ہیں؟ آپ انہیں ساتھ نہیں لائے؟" ڈاکٹر صاحب غالباً یہ سمجھے تھے کہ تار کسی بیماری کے سلسلے میں دیا گیا ہوگا۔

"وہ تو بہت ضد کر رہا تھا۔ ساتھ آنے کے لیے مگر میں نے کہا کہ پہلے مجھے جا کر بات تو کرنے دو" بڑے میاں نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا تو آپ ہی فرمایئے کیا بیماری ہے صاحبزادے کو؟" ڈاکٹر صاحب نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"بیماری!" بڑے میاں چونکے مگر فوراً ہی ایک فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے بولے "اماں ڈاکٹر' آدمی پر مذاق ہو۔"

انہوں نے ایک اور قہقہہ بلند کیا۔

"بخدا تم نے خوب کہا یہ محبت واقعی ایک بیماری ہی ہوتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" ڈاکٹر صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"اماں مطلب مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ پوچھو ان برخوردار سے جو تمہاری صاحب زادی کی محبت میں مبتلا ہو چکے ہیں اور مجھے تار دے کر بلایا ہے کہ شادی کروں گا تو ڈاکٹر عزیز الحق کی بیٹی سے ورنہ زہر کھا لوں گا۔"

"کیا!" ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ سے قلم گر پڑا۔ "آخر آپ ہیں کون اور کیا چاہتے ہیں؟"

"میں اسی لیے چپراسی سے کہہ رہا تھا کہ ایک کارڈ اور لے جاؤ" بڑے میاں نے سنبھل کر جواب دیا "بہرحال میرا نام احمد علی خان ہے اور میں برخوردار جمیل سلمہ کا والد بزرگوار ہوں اور تمہاری بیٹی عزیزی عذرا سلمہا سے اپنے بیٹے کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔ خاندانی اعتبار سے خالص پٹھان ہوں' مالی اعتبار سے گورنمنٹ کی ٹھیکے داری میں لاکھوں کمایا ہے اور اس وقت بھی تمہاری دعا سے تین ذاتی مکان اور چالیس پینتالیس لاکھ نقد بینک بیلنس رکھتا ہوں۔ جہاں تک برخوردار کا تعلق ہے تو اس سال بی اے میں فیل ہو چکا ہے مگر اسے یوں بھی پاس ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی کہ خدا کا دیا سب کچھ گھر میں موجود ہے۔ تمہاری لڑکی کو کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اب بولو کیا کہتے ہو؟"

"آپ کا مطلب ہے' وہ جمیل جس نے میرے اسپتال میں ملازمت کی درخواست دی تھی؟"

"حماقت کی تھی اس گدھے نے" بڑے میاں نے جواب دیا "اور پتا ہے میں نے پوچھا تو اس نے کیا جواب دیا کہنے لگا عذرا کے قریب رہنا چاہتا ہوں۔"

"معاف کیجیے۔ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔ اپنی بیٹی کا ہاتھ اس لاابالی نوجوان کے ہاتھ میں نہیں دے سکتا۔"

"تو میرے ہاتھ میں دے دینا' میں اس کے ہاتھ میں دے دوں گا۔ بات ایک ہی ہے" بڑے میاں نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

"جی نہیں' میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے یہ رشتہ بالکل منظور نہیں" ڈاکٹر صاحب نے سخت لہجے میں کہا۔

"وہ جمیل سلمہ لکھ پتی باپ کا بیٹا ہے۔"

"شادی دولت سے نہیں کی جاتی۔"

"برخوردار بہترین شاعر بھی ہے اور کہتا ہے کہ عذرا اس کی شاعری پر جان دیتی ہے۔"

"میں شاعری کو بکواس خیال کرتا ہوں اور میری نگاہ میں آج کل کے سر پھرے تک

بندوں سے زیادہ نکمی اور کوئی مخلوق نہیں ہے۔ جہاں تک عذرا کا تعلق ہے' آپ اس پر بہتان لگا رہے ہیں۔ میری بیٹی اتنی کم عقل نہیں ہو سکتی۔"

"مگر وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔"

"یہ محبت نہیں حماقت ہے۔ میں اس حماقت کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"خواہ برخوردار جمیل اور برخورداری میرا مطلب ہے عذرا سلمہا زہر کھا کے مرجائیں؟"

"اول تو مجھے بالکل یقین نہیں کہ جمیل نے عذرا کے متعلق جو کچھ آپ سے کہا ہے' وہ سچ ہے۔" ڈاکٹر صاحب انتہائی غصے سے بولے۔ "لیکن اگر یہ سچ بھی ہو تو میں اپنے ہاتھ سے عذرا کو گولی تو مار سکتا ہوں مگر اس کی شادی جمیل سے نہیں کر سکتا۔"

"اماں ڈاکٹر' مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم اب تک آدمیوں کا نہیں' جانوروں کا علاج کرتے رہے ہو" بڑے میاں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اتنا نہیں جانتے کہ آج کل بزرگوں کی بزرگی کا بھرم اسی وقت تک قائم رہتا ہے جب تک وہ بے چون وچرا اولاد کے کہنے پر عمل کرتے رہتے ہیں۔ ذرا سوچو اگر عزیزہ عذرا سلمہا تمہارے منہ پر کہہ دے کہ وہ جمیل سے محبت کرتی ہے اور صرف اسی سے شادی کرے گی تو تمہاری کتنی عزت رہ جائے گی۔"

"اگر عذرا نے اس بے حیائی کا مظاہرہ کیا تو میں زندگی بھر اس کی صورت نہیں دیکھوں گا" ڈاکٹر صاحب کھڑے ہو گئے "اور براہ کرم اب آپ تشریف لے جائیں۔ میں نے اب تک بڑے صبر سے آپ کی لایعنی باتیں سنی ہیں مگر برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ میں جمیل ہی کو کہہ رہا تھا مگر آپ تو بے ہودگیوں میں اس سے بھی دو قدم آگے ہیں۔"

"ظاہر بات ہے میں آخر کو اس کا باپ جو ٹھہرا" بڑے میاں نے جواب دیا۔ اٹیچی اٹھائی اور دروازے کی طرف چلے۔

"ایک بات اور۔۔۔" وہ ایک دم گھوم کر بولے "اچھا شاہد کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"شاہد۔۔۔ اس کا آپ سے کیا تعلق؟"

"کچھ نہیں میں یونہی تمہاری رائے پوچھ رہا تھا۔"

"میں اب آپ کے کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

"اماں ڈاکٹر' تم تو ہر بات پر جیسے کاٹنے کو دوڑتے ہو" بڑے میاں نے بڑی خفگی سے کہا "اچھا وہ میرا کارڈ واپس کر دو۔ جب تم میرے بیٹے کا رشتہ منظور نہیں کر سکتے تو میں اپنا کارڈ کیوں چھوڑوں؟"

اسپتال سے نکل کر بڑے میاں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور سیدھے ریگل مارکیٹ پہنچے۔ مشتاق اپنی دکان پر اکیلا ہی تھا۔ بڑے میاں کو دکان میں داخل ہوتے دیکھا تو مسکرانے لگا۔

"کہو صاحب زادے! کیا رہا؟ شادی طے کر آئے؟" اس نے پوچھا۔

"ابے نامعقول۔۔۔" بڑے میاں نے اٹیچی کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے جواب دیا "میں تیرے باپ کی عمر کا ہوں اور تو مجھے صاحب زادے کہہ رہا ہے۔ میرا نہیں تو اس سفید داڑھی کا ہی خیال کیا ہوتا۔"

"ایسی تیسی اس سفید داڑھی کی" مشتاق نے ہاتھ بڑھا کر داڑھی نوچ لی۔

"ہائیں او گدھے بزرگوں کی داڑھی پر ہاتھ ڈالتا ہے" جمیل نے کہا اور داڑھی کے باقی بال بھی چہرے سے نوچ کر الگ کرنے لگا۔

"کام بن گیا؟" مشتاق نے پوچھا۔

"اب یہ تو ٹیپ ریکارڈ کا ٹیپ بتائے گا" جمیل نے جواب دیا "اچھا بیٹے خان اب ذرا اپنی ورکشاپ میں چلے چلو۔ ڈاکٹر صاحب نے فقرے تو مطلب کے کہہ دیئے ہیں مگر ابھی بڑا کام باقی ہے۔ یہ تمام گفتگو باقاعدہ ایڈیٹنگ کر کے دوسرے ٹیپ میں منتقل کرنا ہے۔"

دکان کے پچھلے حصے میں ریڈیو وغیرہ مرمت کرنے کے لیے مشتاق نے ایک چھوٹی سی ورکشاپ بنا رکھی تھی۔ جمیل نے اٹیچی کھول کر اس میں رکھا ہوا ٹیپ ریکارڈر نکالا اور پہلے ٹیپ کو بجا کر سنا۔ تمام گفتگو بڑی واضح اور صاف آئی تھی۔ جمیل نے ڈاکٹر صاحب کے تمام فقروں کو بڑے غور سے سنا' ان فقروں کو ذہن میں رکھتے ہوئے سوالات کی نئی ترتیب بنائی اور مشتاق سے کہا کہ وہ سوالات اپنی آواز میں ریکارڈ کرائے۔ ایک دوسرے ٹیپ ریکارڈر

پرنیا ٹیپ چڑھایا اور جو مکالمہ اس کے اور ڈاکٹر کے درمیان ہوا تھا اسے اس طرح ٹیپ کرنے لگا جیسے وہ باتیں مشتاق اور ڈاکٹر کے درمیان ہوئی ہوں۔ مثال کے طور پر مشتاق نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب میں اس لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ آپ میرے بیٹے شاہد کو اپنی غلامی میں قبول فرمالیں۔ یہ فقرہ ٹیپ ہو چکا تو اس ٹیپ ریکارڈ کو چلایا گیا جس میں گفتگو بھری ہوئی تھی اور اس سوال کے بعد ڈاکٹر صاحب کا یہ جواب دوسرے ٹیپ پر آیا کہ معاف کیجئے مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔ اس طرح اس نے پوری گفتگو کو اس انداز میں ٹیپ کرلیا جس سے سننے والا یہی سمجھتا کہ ڈاکٹر صاحب نے بڑی سختی سے شاہد کے ساتھ عذرا کی شادی کرنے سے انکار کردیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی زبان سے شاہد کا نام کہلوانے کے لیے اس نے دانستہ آخری سوال کیا تھا اور اس نام کو بڑی مہارت سے وہاں وہاں فٹ کیا گیا جہاں ڈاکٹر صاحب نے جمیل کا نام لیا تھا۔

دو گھنٹے کی ایڈیٹنگ کے بعد دوسرا ٹیپ تیار ہو چکا تھا۔ جمیل نے ایک مرتبہ پھر ٹیپ ریکارڈر اٹھا کر اٹیچی میں بند کیا اور مشتاق کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دکان سے نکل آیا۔ اب اس کا رخ ڈاکٹر عزیز الحق کی کوٹھی کی جانب تھا۔

عذرا کوٹھی پر ہی مل گئی، جمیل کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے آگے بڑھی۔

"میں آپ کو یاد کر رہی تھی" اس نے کہا "گیارہ تاریخ کو ایک مشاعرہ ہو رہا ہے۔ آپ کا پتا کسی کو معلوم نہیں تھا۔ منتظمین نے مجلس خواتین کے آفس سے رجوع کیا کہ ہم جناب شاہد صاحب کو بھی بلانا چاہتے ہیں۔ وہ کہاں مل سکتے ہیں دفتر والے یہ جانتے تھے کہ میں آپ کو لے کر آئی تھی۔ چنانچہ دفتر سے منتظمین کو میرا فون نمبر دے دیا گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے مجھے رنگ کیا اور التجا آمیز انداز میں کہا کہ اگر میں شاہد صاحب کو مشاعرے میں شرکت کے لیے آمادہ کرسکوں تو میری عین نوازش ہوگی اور وہ میرے انتہائی ممنون و مشکور ہوں گے۔"

"اچھا" جمیل نے یونہی کہا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"جی ہاں دیکھ لیجئے۔ ایک ہی مشاعرے کی شرکت نے آپ کو کہاں سے کہاں پہنچادیا ہے" عذرا نے جواب دیا "میں سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کروں اگر آپ نے منع نہ کردیا ہوتا تو

میں اسپتال پہنچ جاتی یا پھر فون کرتی۔"

اچانک وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"مگر آپ کو تو اس وقت اسپتال میں ہونا چاہیے تھا" اس نے کچھ تعجب سے کہا۔

"میں آج آفس نہیں گیا تھا" جمیل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

عذرا اب بڑے غور سے جمیل کی صورت دیکھ رہی تھی۔

"کیوں؟" اس نے جلدی سے پوچھا "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ کچھ پریشان سے نظر آرہے ہیں۔"

"یہ دیکھو" جمیل نے جیب سے کاغذ نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا "میں نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"اور میں آج ہی اس شہر سے ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں" جمیل نے جیسے اپنی ہی دھن میں بولتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لیے شاہد صاحب، میرے صبر کا زیادہ امتحان نہ لیجئے۔ مجھے بتائیے آخر کیا بات ہے؟" عذرا نے پریشانی سے پوچھا "آج آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ جس شخص سے جینے کی امنگ اور زندگی کا حوصلہ چھین لیا جائے وہ یا تو خودکشی کرلیتا ہے یا پھر اس دنیا کو چھوڑ کر ویرانوں میں نکل جاتا ہے" جمیل نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "خودکشی میں اس لیے نہیں کرسکتا کہ یہ حرام موت ہوگی۔ اس لیے اب اپنی آرزوؤں کی لاش اپنے ہی کندھوں پر اٹھائے کسی ایسی جگہ چلا جانا چاہتا ہوں جہاں میں دل کھول کر اپنی بربادیوں پر آنسو تو بہا سکوں۔"

"شاہد صاحب میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں خدا کے لیے کچھ تو بتائیے" عذرا سچ مچ بے تاب ہوئی جا رہی تھی۔

"کیا بتاؤں۔ بتانے کے لیے میرے پاس رہا ہی کیا ہے" جمیل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں تمہاری محبت کے قابل نہیں ہوں۔ ڈاکٹر صاحب ہماری شادی ہرگز منظور نہیں کریں گے مگر تم نے۔۔۔ ہاں تم نے عذرا، میرے دل

میں امیدوں کی شمعیں جلائیں، آرزوؤں کے چراغ روشن کیے۔ وہ چراغ جن کو تمہارے باپ کے چند فقروں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گل کردیا۔ چراغ بجھ چکے ہیں۔ ان کا دھواں اٹھ رہا ہے۔ میرے دل ودماغ میں گھٹ رہا ہے۔ اب بتاؤ، خدا کے لیے بتاؤ کہ میں اس گھٹن کو لے کر کہاں جاؤں؟"

"کیا ابا جان نے شادی سے انکار کردیا ہے؟" عذرا نے فق ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں۔"

"آپ نے ان سے خود بات کی تھی۔"

"نہیں تمہاری خاطر اپنے بوڑھے باپ کو ذلیل ہونے بھیجا تھا۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔ ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"میں جانتا تھا تم یہی کہو گی" جمیل نے پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری "اس لیے ابا جان کے ساتھ ایک ٹیپ ریکارڈ بھی بھیج دیا تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میری شادی میرے والدین پہلے ہی کہیں طے کرچکے تھے مگر میں نے تمہاری محبت کی خاطر ان کے فیصلے کو ماننے سے انکار کردیا۔ وہ بگڑے، خفا ہوئے، گھر سے نکالنے کی دھمکیاں دیں، زندگی بھر منہ نہ دیکھنے کی قسمیں کھائیں مگر میں نے کہا یہ میرا ہی نہیں ایک معصوم لڑکی کی زندگی کا بھی سوال ہے۔ عذرا میری بے وفائی کو برداشت نہیں کرسکے گی اور اگر وہ مجھے نہ ملی تو میں بھی زہر کھا کر مرجاؤں گا۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ آخر وہ میرے ماں باپ تھے اور میں ان کی اولاد تھا۔ میری خوشی کے لیے انہوں نے اپنے جذبات کی قربانی دے دی۔ میری بات مان لی اور شادی کا پیام لے کر ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے۔ اب وہاں جو کچھ گفتگو ہوئی تم خود اپنے کانوں سے سن لو۔"

یہ کہہ کر جمیل نے ٹیپ ریکارڈر آن کردیا۔ عذرا آنسو بھری آنکھوں اور ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ سب کچھ سنتی رہی۔ کوئی شبہ نہیں شاہد بالکل سچ کہہ رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے صاف انکار ہی نہیں کیا تھا، شاہد کے باپ کی توہین بھی کی تھی۔ یہ بھی کہا تھا کہ اگر عذرا نے اس معاملے پر خود ان کے سامنے بے حیائی اوڑھ کر بات کرنے کی کوشش کی تو

وہ اسے گولی ماردیں گے، اس کی صورت نہیں دیکھیں گے۔ آخر ان کا دل اتنا پتھر کیوں ہوگیا تھا؟ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی خوشیوں کے دشمن کیوں بن گئے تھے؟ عذرا کو وہم وگمان بھی نہیں تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی طرف سے اتنی شدید مخالفت کا اظہار کیا جائے گا۔ ٹیپ ختم ہوا تو وہ بری طرح آنسو بہا رہی تھی۔

"ہاں عذرا خوب جی بھر کے رو" جمیل نے ٹیپ ریکارڈر بند کرتے ہوئے ایک اور ٹھنڈی سانس بھری "خوب آنسو بہاؤ۔ اتنے بہاؤ، اتنے بہاؤ کہ آنکھوں کے سوتے خشک ہوجائیں کیونکہ تم اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی ہو۔"

ایک دم عذرا نے جیسے کسی مصمم فیصلے پر پہنچتے ہوئے دوپٹے کے آنچل سے آنکھیں خشک کرلیں۔

"میں ابا جان سے بات کروں گی" وہ گردن اٹھاتے ہوئے بولی۔

"کیا فائدہ" جمیل نے مایوسی سے سرہلایا "وہ تمہیں گولی ماردیں گے۔"

"بلا سے ماردیں۔ میں محبت میں جان دینے سے نہیں ڈرتی۔"

"مگر میں ڈرتا ہوں؟" جمیل نے کہا۔

عذرا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"مگر میں ڈرتا ہوں..." جمیل نے پھر دہرایا "کہ یہ ہماری محبت کی جیت نہیں ہار ہوگی۔ تم تو بے شک گولی کھا کر مرجاؤ گی مگر میں تمہاری موت اور محبت کی شکست پر ماتم کرنے کے لیے زندہ رہ جاؤں گا۔ کیا تم مجھے زندگی بھر کے لیے ان شعلوں میں جھونک دینا چاہتی ہو۔ نہیں، اب ہمارے سامنے صرف دو ہی راستے ہیں یا تو تم ظالم سماج کے ظالم رسم ورواج کے سامنے سر جھکا دو، مجھے بھول جاؤ۔ جس سے تمہارے والد کہیں شادی کرلو اور میں اپنی ناکام زندگی کو لے کر کہیں دور بہت دور چلا جاؤں۔

"یا پھر میری طرح تم بھی اس سنگدل، جابر، وحشی، بے رحم معاشرے کے خلاف بغاوت کردو اور یہ ہماری محبت کی لازوال جیت ہوگی۔ اب تک زمانے کی آنکھوں نے یہی دیکھا ہے کہ کوئی صحراؤں کی خاک چھانتے چھانتے مرگیا، کسی نے سر میں تیشہ مار کر خودکشی کرلی، کسی نے زہر کھالیا یا دریا میں کود کر جان دے دی مگر ہم یہ سب کچھ نہیں کریں گے۔

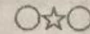
یہ بزدلی ہے' ہم محبت میں شادی کریں گے اور زمانے کے سینے پر مونگ دلیں گے۔ ڈاکٹر صاحب سے گفتگو کرنے میں کامیابی کی ذرا سی بھی امید ہوتی تو میں تم سے پہلے خود ان کے قدموں میں گرنے کو تیار تھا مگر تم نے ان کا لب ولہجہ سن لیا۔ اب تو جو کچھ کرنا ہے خود ہمیں کرنا ہے۔ دونوں راستے تمہارے سامنے ہیں اور میں تمہارے فیصلے کا منتظر ہوں' بولو کیا کہتی ہو؟"

"اگر آپ میرے ساتھ آخری حد تک جانے کے لیے آمادہ ہیں تو میں آپ سے پیچھے نہیں رہوں گی" عذرا نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"زندہ باد!" جمیل اچھل پڑا "تو پھر وعدہ کرو۔"

"وعدہ!" عذرا نے جمیل کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے جوش کے ساتھ کہا۔

"تو پھر کل رات گیارہ بجے مون لائٹ کلب میں تیار ملو۔" جمیل نے اٹیچی اٹھاتے ہوئے کہا "ایک ہوائی جہاز ٹھیک ساڑھے بارہ بجے فیروز آباد روانہ ہوتا ہے۔ میں اس میں دو سیٹیں ریزرو کرالوں گا۔"



"ارے بیوی' میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ یہ برخوردار پھر کوئی چکر چلا رہے ہیں مگر تمہاری سمجھ میں ہی نہیں آتا۔" احمد علی صاحب نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہا "میرے حلق سے تو یہی بات نہیں اترتی کہ انہیں کہیں ملازمت مل رہی ہے۔ آج کل ایم اے پاس مارے مارے پھر رہے ہیں' بی اے فیل کو کون پوچھے گا؟"

"افوہ ڈیڈی' آپ کو تو کسی طرح یقین ہی نہیں آتا کہ جو ملازمت مجھے مل رہی ہے اس میں تعلیم کا سوال نہیں۔ انہیں ہوشیار' چست وچالاک اور ذرا رعب دار آدمی چاہیے تاکہ مزدوروں کو اپنے قابو میں رکھ سکے۔

"تغلق پور میں بہت بڑی شوگر فیکٹری ہے ان کی۔ اس کے علاوہ آپ جانتے ہیں کہ آج کل سفارش سے بڑے بڑے کام نکلتے ہیں۔ میں ایک بہت بڑے سرکاری افسر کا خط لے کر انٹرویو دینے گیا تھا۔"

"ذرا ان رعب دار صاحب زادے کی صورت دیکھنا" احمد علی صاحب دھواں چھوڑتے ہوئے بولے "اس بڑھاپے میں بھی ایک ہاتھ رسید کردوں تو دو دن تک بستر سے نہیں اٹھا جائے گا۔"

"اے تو ماشاءاللہ بیٹا بھی تو آپ ہی کا ہے۔" بیگم صاحبہ نگاہوں سے جمیل کی بلائیں لے کر بولیں "خدا نظر بد سے بچائے' سیکڑوں میں کیا ہزاروں جوانوں میں الگ دکھائی دیتا ہے۔"

احمد علی صاحب غیر شعوری طور پر اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے لگے۔

"اتنی اچھی ملازمت قسمت سے ہی ملا کرتی ہے ڈیڈی!" جمیل نے پھر کہا "رہنے کے لیے بنگلا' سواری کے لیے کار' خدمت کے لیے دو دو ملازم۔"

"مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تم سفارشی خط بھی لے گئے تھے تو پھر نقد ضمانت کی کیا ضرورت ہے اور وہ بھی یکشت دس ہزار" احمد علی صاحب نے کہا۔

"دیکھیے نا ڈیڈی جگہ ایسی ہے کہ ہر وقت ہزاروں روپے کا کیش میرے پاس رہے گا۔ آخر کوئی اجنبی پر ایک دم کیسے اعتماد کرلے۔ پھر یہ ان کے یہاں کا اصول ہے۔ میری خاطر وہ اپنا اصول کیسے بدل دیں۔"

"شخصی ضمانت سے کام نہیں چل سکتا؟"

"اگر چل سکتا تو پھر مجھے آپ کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت تھی۔" جمیل نے اپنی اماں کی طرف دیکھا۔

"امی آپ بھی ذرا کہہ دیں نا۔ دس ہزار ہی کی تو بات ہے۔ روپیہ جیسے بینک میں رکھا رہے ویسے ہی وہاں ان کے پاس رہے گا۔ لاکھوں کروڑوں کے مالک ہیں دس ہزار ہضم کرکے تو نہیں بیٹھ جائیں گے پھر یہ کہ باقاعدہ اس کی رسید دیں گے اور یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ دو سال کی ملازمت کے بعد ضمانت واپس کردیں گے۔"

"اے میں نے کہا دے دو نا" بیگم صاحبہ نے بیٹے کی طرف داری کرتے ہوئے کہا "یا تو اسے تین دن میں نوکری نہ ملنے پر گھر سے نکالے دے رہے تھے یا اب مل رہی ہے تو کرنے نہیں دیتے۔ اللہ رکھے روزگار سے لگ جائے تو میں اس کا گھر بسانے کی فکر کروں۔"

اختر بھیا بھی کہتے ہوں گے کہ بھابی منہ سی کے بیٹھ گئی ہیں۔"

"ارے بھئی خوب یاد دلایا تم نے بیوی" احمد علی صاحب چونک کر بولے "میں تو تمہیں بتانا بھول ہی گیا تھا۔ اختر تو اب یہیں آگیا ہے۔"

"اے کب؟ اور یہاں آکر جھانکے تک نہیں" بیگم صاحبہ ناک پر انگلی رکھ کر بولیں "اب آئیں دیکھنا کیسی خبر لیتی ہوں۔ واہ یہ بھی کوئی بات ہے؟"

"بھئی وہ مجھ سے معذرت کر کے گیا تھا" احمد علی صاحب نے بتایا "شو مارکیٹ میں دکان لینے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔ کہہ رہا تھا ذرا ٹھور ٹھکانے سے بیٹھ جاؤں تو سمدھن کے سلام کو حاضر ہوں گا۔"

"دیکھا آپ نے' وہ بات مار گئے اور ایک آپ ہیں کہ کوئی فکر ہی نہیں ہے۔"

"آئیں۔ کیا' کب' کہاں؟" احمد علی صاحب کے منہ سے حقے کی نے نکل گئی۔ "مجھے تو اس سیدھی سی بات میں کوئی ہیر پھیر نہیں معلوم ہوا۔"

"بجائے بھابی کہنے کے سمدھن کہا ہے انہوں نے" بیگم صاحبہ نے سمجھایا۔

"اس کا مطلب یہی ہوا کہ انہوں نے ہمیں اپنا وعدہ یاد دلایا ہے اور بات ہے بھی ٹھیک۔ جوان لڑکی کو کب تک گھر میں بٹھائے رہیں؟"

"اچھا بھئی اچھا مگر برخوردار کسی قابل تو ہو جائیں۔"

"اسی لیے تو کہتی ہوں کہ روپیہ دے دیجئے" بیگم صاحبہ خوش ہو کر بولیں "پہلی تنخواہ ہاتھ میں آتے ہی تاریخ طے کر آؤں گی۔"

احمد علی صاحب جمیل کی طرف متوجہ ہوئے۔

"دیکھو برخوردار' دس ہزار روپیہ زرِ ضمانت تو میں دے دوں گا مگر تمہیں ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ کتنی تنخواہ بتائی تھی تم نے؟"

"تین ہزار روپے ڈیڈی!"

"تو سو روپے اپنے خرچ کے لیے رکھ کر باقی انتیس سو ہر مہینے پوری پابندی سے اپنی ماں کو بھیجو گے۔"

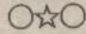
"دیکھئے تو امی' سو روپے میں میرا گزارا کیسے ہوگا؟" جمیل نے ماں سے شکایت کی

"اتنی بڑی جگہ ہے۔ بنگلہ میں رہوں گا تو اسی حساب سے دوسری باتوں کا خیال بھی رکھنا پڑے گا۔"

"تم اپنے باپ کو کہنے دو' ان کی باتیں تو ایسی ہی ہوتی ہیں۔ جتنا ضرورت سے بچ جائے بھیج دیا کرنا" بیگم صاحبہ نے جواب دیا۔

"بس یہی سبق دے دے کر تو تم نے ستیاناس مار دیا ہے لڑکے کا" احمد علی صاحب نے تیزی سے کہا "کان کھول کر سن لو صاحب زادے' اگر پندرہ سو روپے ہر ماہ بھیجنے کا وعدہ کرتے ہو تو روپے ملیں گے ورنہ جاؤ ہوا کھاؤ۔ میرے پاس نہیں ہیں دس ہزار روپے۔"

"اچھا ڈیڈی بھیج دیا کروں گا" جمیل نے جیسے بڑی مری ہوئی آواز میں وعدہ کر لیا۔



شاہد نے دروازہ کھول کر دیکھا تو جمیل ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کر رہا تھا۔ قریب ہی ایک سوٹ کیس بھی رکھا ہوا تھا جو بالکل نیا خریدا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

"خیریت تو ہے" شاہد نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے حیرت سے کہا "یہ مع سازو سامان کے۔ کہیں چچا جان نے گھر سے نکال تو نہیں دیا؟"

"کچھ ایسی ہی بات ہے یار!" جمیل نے سوکھے منہ سے بتایا "تمہارے سامنے ہی تو انہوں نے تین دن کا الٹی میٹم دیا تھا۔ تین دن چھوڑ ایک مہینہ ہونے کو آیا مگر نوکری نہیں ملی' آج انہوں نے کان پکڑ کر گھر سے باہر کر دیا کہ جاؤ بیٹا عیش کرو۔"

"مذاق تو نہیں کر رہے ہو" شاہد بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"لعنت ہے مذاق کرنے والے پر۔ یعنی سوٹ کیس دیکھ رہے ہو اور پھر بھی یقین نہیں کرتے" جمیل بولا "اب تو بھیا تمہارے گھر ڈیرا جمانے آیا ہوں مگر تم ڈرائنگ روم تو کھولو۔ اطمینان سے بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔"

شاہد نے ڈرائنگ روم کھول دیا۔ جمیل سوٹ کیس اٹھا کر اندر آیا۔ اسے صوفے کے پیچھے رکھ دیا اور کوٹ اتار کر ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے صوفے پر پیر پھیلا کر لیٹ گیا۔

"بھئی مجھے اب تک یقین نہیں آتا کہ چچا جان تمہیں اتنی سی بات پر گھر سے نکال سکتے ہیں۔" شاہد نے کہا۔

"اب تم یقین نہ کرو تو اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں" جمیل سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا "کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تم مجھے اپنے گھر میں ٹھہرانے سے گھبرا رہے ہو؟"

"کیا حماقت کی باتیں کر رہے ہو" شاہد نے ڈانٹا "تم میرے دوست ہو اور دوست کے لیے جان بھی حاضر ہے۔ تم شوق سے یہاں رہ سکتے ہو مگر اس کے باوجود میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ محض ملازمت نہ ملنے پر اگر چچا جان سچ مچ بھی تمہیں نکالنے پر آمادہ ہو جائیں تو تم ایسے گرو گھنٹال کے لیے ان جیسے سادہ مزاج انسان کو اپنی باتوں سے کسی فرضی ملازمت کے مل جانے کا یقین دلانا کیا مشکل ہے۔ تم ایک ہزار ایک بہانے بنا کر اپنی جان بچا سکتے تھے۔"

جمیل نے ایک قہقہہ بلند کیا۔ شاہد حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"آخر برسوں سے دوست چلے آ رہے ہو" جمیل نے ہنستے ہوئے کہا "تم سے زیادہ مجھے کون سمجھ سکتا ہے مگر بھئی یہ بات ہے، بہت بری کہ اب اگر میں واقعی کسی پریشانی میں بھی پڑ جاؤں تو لوگ اس کا یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔"

"تو میرا خیال ٹھیک ہی تھا۔" شاہد نے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"صرف اس حد تک کہ مجھے گھر سے نکالا نہیں گیا۔ میں خود ہی نکل گیا ہوں" جمیل نے ہاتھ جھٹک کر سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے جواب دیا "اور استاد اب تم خط غلامی لکھنے کے لیے تیار ہو جاؤ کیونکہ اس کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ تم شرط ہار چکے ہو۔"

"کیسی شرط؟" شاہد نے پوچھا۔

"بھول گئے۔۔۔ تم نے بڑے زور و شور سے دعویٰ کیا تھا کہ میں دوسری لڑکیوں کی طرح عذرا کو بے وقوف نہیں بنا سکتا۔"

"میں اب بھی یہی کہتا ہوں" شاہد ایک دم سنجیدہ سا نظر آنے لگا "دیکھو جمیل میں نے کبھی تمہارے ان معاملات میں دخل نہیں دیا لیکن عذرا کے معاملے میں تم سے ضرور کہوں گا کہ تم اس کا پیچھا چھوڑ دو۔ وہ اتنی اچھی لڑکی ہے کہ اسے تمہارے ہاتھوں احمق بنتے دیکھ کر مجھے افسوس ہو گا۔"

"تم بھول رہے ہو دوست کہ میں نے تم سے اسے حاصل کرنے کی شرط لگائی ہے"

جمیل نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اس کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے احمق بناتے بناتے میں خود احمق بن چکا ہوں اور وہ بھی اس حد تک کہ ہر طرح کے انجام سے آنکھیں بند کر کے آج رات ساڑھے بارہ بجے کے ہوائی جہاز سے اس کے ساتھ فیروز آباد جا رہا ہوں۔"

"کیا!" شاہد صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے غور سے جمیل کی طرف دیکھا۔

"یہ کوئی دوسری شرارت ہے؟" وہ چند لمحہ سکوت کے بعد بولا۔

"شرارت نہیں دوست! محبت۔"

"گویا تم سچ مچ عذرا کے ساتھ فرار ہو رہے ہو؟"

"ہاں یہ دنیا اپنے چنگل سے دو محبت کرنے والوں کے آزاد ہونے کو اسی نام سے پکارتی ہے۔" جمیل نے ایک اور قہقہہ بلند کرتے ہوئے جواب دیا۔

شاہد کے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ وہ ایک سکتے کی سی کیفیت میں جمیل کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ عذرا کو مشاعرے میں دیکھ کر اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو بے ربط ہوتے محسوس کیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا خوب صورت خیال شاہد کے دل و دماغ میں بس کر رہ گیا تھا اور شاہد اپنے آپ سے بھی یہ اعتراف کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کہ اسے عذرا سے محبت ہو گئی ہے۔ ایک ایسی بے معنی چاہت جس کا کوئی حاصل نہ تھا۔ جمیل درمیان میں نہ بھی ہوتا تب بھی عذرا شاہد کی دسترس سے بہت دور تھی۔ شاہد نے خود اپنے آپ کو مشورے دیے کہ صاحب زادے ایسی حماقت میں مبتلا ہونے سے کیا فائدہ جس کا انجام پہلے سے معلوم ہو مگر اس کا کیا علاج کہ دل ان معاملات میں ہمیشہ اپنی من مانی کرتا آیا ہے اور اس کا بھی کیا علاج کہ بعض حماقتیں اتنی پیاری ہوتی ہیں کہ بے اختیار ان میں مبتلا ہونے کو جی چاہتا ہے۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو جمیل" آخر شاہد نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا "اگر یہ بھی تمہارا کوئی کھیل نہیں ہے اور تم اس سے واقعی محبت کرنے لگے ہو تو اسے شریفانہ طریقہ پر اپنانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

"میں اس معاملے پر ہر پہلو سے غور کر چکا ہوں دوست" جمیل نے جواب دیا۔ "یقین

کرو‘ اس کے سوا عذرا کو اپنا بنانے کا اور کوئی راستہ نہ تھا‘ ڈاکٹر صاحب کو خدا معلوم کیوں مجھ سے لِلّٰہی بغض ہے۔ میں نے ایک دوست کے ذریعے ان کے سامنے شادی کی تجویز رکھی تھی مگر وہ سنتے ہی بھڑک اٹھے کہ عذرا کو گولی مار دوں گا مگر جمیل سے اس کی شادی نہیں کر سکتا‘ پھر یہ کہ خود میرے والدین بھی اس رشتے پر آمادہ نہیں ہوں گے‘ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ڈیڈی میری منگنی اپنے ایک دوست اختیار خان جوتے والوں کی بیٹی سے کر چکے ہیں اور اب ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر جناب احمد علی صاحب کپڑے والے اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ جمیل سلمہ کی شادی اگر ہو گی تو اختیار خان جوتے والوں کی بیٹی سے ہو گی‘ پھر تم ہی بتاؤ‘ میں اور کیا کرتا۔ اس کے علاوہ میں ہرگز عذرا کی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتا‘ میرا ارادہ نیک نیتی کے ساتھ اس سے شادی کرنے کا ہے۔ فیروز آباد پہنچ کر ہم نکاح کر لیں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہاں دونوں بوڑھے بہت غل غپاڑہ مچائیں گے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ان کی ناراضگی بھی ختم ہو جائے گی۔ کچھ عرصے کے بعد جب معاملات ٹھنڈے پڑ جائیں گے تو ہم دونوں واپس آ جائیں گے اور یقین کرو کہ ڈیڈی اور ڈاکٹر صاحب دونوں بڑی خوشی سے ہمیں معاف کر دیں گے۔"

"مگر تم نے یہ بھی سوچا کہ اس طرح عذرا بدنام ہو جائے گی" شاہد نے اس طرح کہا جیسے کوئی ڈوبنے والا تنکے کا سہارا لے کر ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کرتا ہے "لوگ ایسے واقعات کبھی نہیں بھولتے اگر سب کچھ اسی طرح بھی ہوا جس طرح تم کہتے ہو تب بھی تم عذرا کے نام سے یہ داغ زندگی بھر نہیں مٹا سکو گے کہ وہ تمہارے ساتھ فرار ہو گئی تھی۔ تم دونوں معاشرے کے سامنے ہمیشہ کے لیے اپنی نگاہیں نیچی رکھنے پر مجبور ہو گے اور کوئی تعجب نہیں کہ اس رسوائی کی بازگشت تمہارے بچوں کی زندگی پر بھی اثر انداز ہو۔"

"میں اتنی دور کی باتیں نہیں سوچا کرتا بھیا" جمیل نے بے پروائی سے جواب دیا "اس کے علاوہ یہ محض تمہارا خیال‘ خیال ہی ہے۔ دنیا اب اتنی ترقی کر چکی ہے کہ ان باتوں کو کوئی بھی اہمیت نہیں دیتا۔ میرے گھر والوں کو کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب اگر عقل مندی سے کام لیں گے تو عذرا کے میرے ساتھ بھاگ جانے سے کوئی واقف نہیں ہو سکتا۔ ہم اخبار میں اشتہار دے کر نہیں جا رہے ہیں۔ جاتے ہوئے ایک خط کے ذریعے

ڈاکٹر صاحب کو تمام باتوں سے آگاہ کر دیں گے۔ اس کے بعد اگر عذرا رسوا ہوتی ہے تو اس میں قصور ہمارا نہیں اس کے باپ کا ہو گا۔"

"اچھا چلو مان لیا کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہی ٹھیک ہے" شاہد ہارے ہوئے جواری کی طرح بولا "تو پھر تم نے آگے کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ تم دونوں فیروز آباد پہنچ گئے پھر۔ پھر کیا کرو گے؟ تمہیں یہاں ملازمت نہیں مل رہی تھی‘ وہاں کیسے ملے گی اور ملے گی بھی تو ڈھائی تین ہزار سے زیادہ کی کیا ملے گی۔ کیا اس رقم میں تم دونوں کا گزارا ہو جائے گا۔"

"تم اس کی فکر مت کرو دوست" جمیل نے مسکراتے ہوئے کہا "میں پہلے ہی سارا پلان تیار کر چکا ہوں‘ یہ دیکھو۔"

اس نے اپنی جیب سے پھولا ہوا بٹوہ نکال کر دکھایا۔ "اس بٹوے میں پورے دس ہزار روپے موجود ہیں۔ میں کوئی کام نہ بھی کروں تب بھی دو ماہ بیٹھ کر کھایا جا سکتا ہے اور اس سے بہت پہلے ہی سارے معاملات ٹھیک ہو چکے ہوں گے۔"

"رقم تم گھر سے چرا کر لائے ہو؟" شاہد نے پوچھا۔

"لاحول ولا قوۃ" جمیل نے منہ بنایا "کیسے گرے ہوئے الفاظ استعمال کرتے ہو یار‘ تم جانتے ہو کہ میں کبھی نقب نہیں لگاتا ہمیشہ سامنے آ کر بات کرتا ہوں۔ ڈیڈی نے خود اپنے ہاتھ سے دس ہزار کا چیک کاٹا تھا اور وہ بھی کیسے نہ کاٹتے۔ بیٹے کو تین ہزار ماہانہ کی ملازمت مل رہی تھی تو کیا دس ہزار کی کیش سیکورٹی بھی جمع نہیں کرا سکتے تھے۔"

"یار لعنت ہے تم پر" شاہد نے بڑے خلوص سے کہا "تم اپنے مطلب کے لیے اپنے والدین کو بھی دھوکا دینے سے باز نہیں آتے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آج تمہیں عذرا سے شادی کرنے میں اپنا فائدہ نظر آ رہا ہے‘ کل اگر اسے چھوڑنے میں کوئی مطلب حل ہوتا دکھائی دیا تو بلاشبہ یہ بھی کر گزرو گے۔"

"بھیا! مجھے اب تجھ سے ڈر لگنے لگا ہے" جمیل اٹھتے ہوئے بولا "آدمی اگر کسی دوسرے پر اتنا کھل جائے تو اسے کسی بھی وقت اس کے ہاتھوں شکست اٹھانے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"کہاں چل دیے؟" شاہد نے پوچھا۔

"کہیں نہیں، ذرا کپڑے بدل کر کچھ دیر سونا چاہتا ہوں" جمیل نے گھڑی دیکھی "ابھی تو صرف پانچ بجے ہیں اور ہوائی جہاز ساڑھے بارہ بجے جاتا ہے ڈیڑھ دو بجے کہیں فیروز آباد پہنچے گا اور پھر کسی ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے ڈھائی تین تو بج ہی جائیں گے۔ میں اگر دن میں نہ سوؤں تو رات میں جاگنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

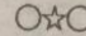
"تمہارا پروگرام کیا ہے؟"

"پروگرام کیا!" جمیل نے بتایا "عذرا سے طے ہے کہ وہ گیارہ بجے مون لائٹ کلب میں ملے گی۔ یہ اس لیے کہ میں اسے لینے ڈاکٹر کی کوٹھی جانا نہیں چاہتا تھا اور کلب ائرپورٹ کے راستے ہی میں پڑتا ہے۔ چنانچہ میں یہاں سے ساڑھے دس بجے چلوں گا۔ گیارہ بجے اسے کلب سے لے کر سوا گیارہ بجے تک ائرپورٹ پہنچ جاؤں گا اور وہاں سے فیروز آباد۔ تم ہمیں چھوڑنے ائرپورٹ تک تو چلو گے نا؟"

"ہاں کیوں نہیں" شاہد نے کسی خیال میں کھوئے ہوئے جواب دیا۔

"جیو، دوست ہو تو ایسا ہو" جمیل بولا "اور ہاں... یا تو اپنی بیاض کچھ دن کے لیے ادھار دے دو یا پھر خود ہی پندرہ بیس غزلیں نقل کر دو۔ یار یہ شاعری کی ہنج میں نے خواہ مخواہ اپنے گلے باندھ لی ہے جب تک عذرا ایک غزل نہ سن لے بات ہی نہیں کرتی۔"

شاہد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بدستور کسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔



شاہد نے آہستہ سے دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم میں جھانکا۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں جمیل بڑے آرام سے صوفے پر بے خبر سو رہا تھا۔ اس وقت جب جمیل کپڑے بدل چکا تھا تو وہ اسے اطمینان سے سونے کے لیے اکیلا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ جمیل نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ جب تک وہ سوئے، شاہد اپنی دس پندرہ غزلیں اسے ایک نوٹ بک پر نقل کر دے مگر شاہد اس درمیان میں غزلیں نقل کرنے کے ساتھ ساتھ بہت کچھ سوچتا بھی رہا تھا۔ وہ بہرحال عذرا کا جمیل کے ساتھ فرار ہونا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ جمیل کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا اور اگر شاہد، احمد علی صاحب یا

ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دینے کی کوشش کرتا تو تو اس سے عارضی طور پر خطرہ ضرور ٹل جاتا مگر پھر کیا کہا جا سکتا تھا کہ جمیل کب اسے اطلاع دیے بغیر ہی کوئی دوسرا پروگرام نہ بنا لے۔ ابھی تو شاہد پر اسے اعتماد تھا لیکن بات کھل جانے پر تعلقات ختم ہونے کا امکان تھا اور اس کے بعد اگر شاہد کی بے خبری میں کچھ ہو جاتا تو یہ پچھتاوا کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا کہ اگر معلوم ہوتا تو شاید اسے روکنے میں کامیاب ہو جاتا۔

دبے پاؤں شاہد میز کی طرف بڑھا جہاں لباس تبدیل کرتے ہوئے جمیل نے منہ ہاتھ دھونے کے لیے اپنی گھڑی اتار کر رکھ دی تھی۔ گھڑی بدستور وہیں رکھی تھی۔ شاہد نے ایک نظر سوئے ہوئے جمیل پر ڈالی اور گھڑی اٹھا کر دیکھی۔ ساڑھے آٹھ بجنے والے تھے۔ اس نے چابی کھینچی اور گھڑی کی سوئیوں کو گھما کر نو پر کر دیا پھر اپنی رسٹ واچ کلائی سے کھولی اور اس میں بھی نو بجا دیے۔ ڈرائنگ روم کی دیوار پر الیکٹرک کلاک بھی ساڑھے آٹھ ہی بجا رہا تھا۔ اسے بھی آدھ گھنٹہ آگے کر دیا اور پھر ایک زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھ کر اس نے ڈرائنگ روم کی بتی جلا دی۔

"میں نے کہا جناب!" وہ جمیل کا کاندھا ہلاتے ہوئے بولا "اٹھیے ورنہ جہاز اڑ جائے گا۔"

جمیل نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا بج گیا بھئی؟" اس نے جماہی لیتے ہوئے پوچھا۔

"میری گھڑی میں تو گیارہ بج رہے ہیں" شاہد نے جواب دیا۔

"کیا!" جمیل صوفے سے اچھل کر میز کی طرف لپکا۔ گھڑی اٹھا کر دیکھی۔

"لاحول ولا قوۃ یار تم نے تو میری جان ہی نکال لی تھی۔ ابھی تو صرف نو بج کر تین منٹ ہوئے ہیں۔" جمیل نے کہا اور گھڑی کلائی پر باندھ لی۔

"کچھ کھانا وغیرہ لاؤں؟" شاہد نے پوچھا۔

رہنے دو بھئی امی نے چلتے وقت اتنا کھلا دیا تھا کہ اب تک ہضم نہیں ہوا ہے" جمیل نے جواب دیا "اس کے علاوہ بہت سی چیزیں سوٹ کیس میں بندھی رکھی ہیں۔"

"تمہاری خوشی" شاہد نے کندھے اچکائے "تو پھر جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

"تم نے غزلیں لکھ دیں؟" جمیل نے پوچھا۔

"ہاں ہاں لکھ دی ہیں مگر اب خود بھی کچھ تک بندی کی مشق کرو میں کہاں تک اپنی غزلیں قربان کرتا رہوں گا۔"

"بس یہ آخری مرتبہ تکلیف دے رہا ہوں" جمیل نے کہا "ظاہر ہے یہ ڈھونگ ہمیشہ تو نہیں چل سکتا۔ شادی ہو جائے تو میں خود ہی مناسب موقع پر عذرا کو بتادوں گا۔"

"تم اچھی طرح جانتے ہو استاد" شاہد بولا "کہ وہ محض میری غزلیں سن کر تم سے محبت کرنے لگی ہے اگر یہ راز کھل گیا کہ تم شاعر تو کیا دائر بھی نہیں ہو تو اس کی محبت، نفرت میں نہ بدل جائے۔"

"بالکل مولوی مدن ہی رہے۔ بچہ جی اتنی بات نہیں جانتے کہ شادی کے بعد عورت نباہ کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اور پھر خاص طور سے اس صورت میں کہ میرے ساتھ فرار ہو رہی ہے۔ ذرا سوچو کہ وہ مجھ سے نفرت کر کے جائے گی کہاں؟"

"ٹھیک کہتے ہو بھائی، اچھا تم تیار ہو میں بھی ذرا کپڑے بدل آؤں" شاہد نے جواب دیا اور کمرے سے نکل گیا۔

دس بجے تک جمیل چلنے کے لیے بالکل تیار ہو چکا تھا۔

"ٹیکسی بلائی جائے یا راستے میں پکڑنے کا خیال ہے" شاہد نے پوچھا۔

"راستے سے ہی لے لیں گے" جمیل نے جواب دیا اور سوٹ کیس اٹھا کر ڈرائنگ روم سے باہر نکلا۔ شاہد بھی باہر سے دروازہ بند کرتے ہوئے اس کے ساتھ چلا۔ ابھی وہ راہداری سے گزر ہی رہے تھے کہ سامنے سے خان صاحب آتے مل گئے۔ وہ غالباً عشاء کی نماز پڑھ کر آرہے تھے۔

"السلام علیکم" جمیل نے دل ہی دل میں جل تو جلال تو کا وظیفہ پڑھتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام" خان صاحب نے تسبیح گھمانا بند کر کے جواب دیا "بھئی جمیل میاں، وہ تمہارا عید میلاد النبی کا جلسہ کب ہو رہا ہے؟"

جھوٹے کو اپنا جھوٹ کب یاد رہتا ہے۔ جمیل بھول بھی چکا تھا کہ اس نے خان صاحب سے کب کیا کہا تھا۔

"جی۔ عید میلاد النبی کا جلسہ!" اس نے پلکیں جھپکائیں "اوہ آپ کا مطلب ہے عید میلاد النبی کا جلسہ۔ جی ہاں وہ تو ہو بھی چکا۔ شاہد کو تو معلوم ہے۔ مولانا عبدالستار صاحب نے وعظ فرمایا تھا۔"

"مولانا عبدالستار!" خان صاحب بولے "مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ مولانا عبداللہ سے وقت لینے جا رہے ہو۔"

"جی ہاں جی ہاں۔ میں نے کہا تھا تو ضرور مولانا عبداللہ سے وقت لینے ہی جا رہا ہوں گا مگر وہ دیکھئے نا مولانا ان دنوں میں بہت مصروف تھے۔ مجبوراً مولانا عبدالستار صاحب کو بلانا پڑا۔"

"خیر خیر مطلب تو ذکر سیرۃ النبیؐ سے ہے" خان صاحب نے گردن ہلاتے ہوئے کہا "مگر میاں تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ حالانکہ میں نے اتنی تاکید سے کہہ دیا تھا۔"

"دیکھئے نا انکل، بس وہ تھوڑی سی غلط فہمی ہو گئی" جمیل نے جلدی سے جواب دیا "دراصل دو جلسے ہو رہے تھے۔ ایک میرے محلے امیر آباد میں اور دوسرا پڑوس کے علاقے غریب آباد میں۔ پہلے غریب آباد کے علاقے میں ہوا۔ میں یہ سمجھا کہ آپ نے امیر آباد کے جلسہ عید میلاد النبیؐ میں شریک ہونے کے لیے کہا ہے۔"

"تو بھئی اسی کی اطلاع دے دی ہوتی۔"

"میں تو خود کہنے کے لیے آنے والا تھا مگر پھر خیال آیا اور خیال کیا آیا شاہد نے ہی یاد دلایا کہ آپ نے غریب آباد کے لیے کہا تھا۔ بڑا افسوس ہوا مگر پھر کیا ہو سکتا تھا۔ وہ جلسہ تو ہو چکا تھا۔"

"ہوں" خان صاحب زیر لب مسکرائے "سچ سچ بتانا میاں، کوئی جلسہ ہوا بھی تھا یا نہیں؟"

"ارے انکل! آپ مجھے بھی شاہد کی طرح جھوٹا خیال کرتے ہیں۔ ابھی کہیں تو دونوں محلوں سے جتنی چاہیں شہادتیں پیش کر سکتا ہوں۔"

"اچھا میاں خیر ہو گا۔ مگر یہ اس وقت تم سوٹ کیس اٹھائے کہاں جا رہے ہو؟" خان صاحب نے پوچھا۔

"دعا کیجیے انکل! آپ کا یہ نالائق بھتیجا جہاد کرنے جا رہا ہے" جمیل نے بڑی انکساری سے کہا۔

"جہاد کرنے!" خان صاحب نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

"جی ہاں فلسطین میں یہودی غاصب ہمارے عرب بھائیوں پر جو ظلم و ستم کر رہے ہیں وہاں کے حریت پسند مجاہدین نے ان کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے ایک چھاپا مار تنظیم الفتح کے نام سے قائم کی ہے۔ عالم اسلام سے اس تنظیم کے لیے ہر قسم کی امداد و اعانت کی جا رہی ہے۔ ہمارے ملک میں بھی اس مجاہد جماعت کا دفتر قائم کیا گیا ہے۔ اور آپ بزرگوں کی دعاؤں سے فلسطین میں جہاد کرنے کے لیے سب سے پہلے میں نے ہی اپنا نام لکھوایا تھا۔ چنانچہ آج مجھے جدہ اور مکہ ہوتے ہوئے بیروت جانے کا حکم دیا گیا ہے۔"

"مرحبا۔ جزاک اللہ! میاں، تمہارے دل میں واقعی ایک جذبہ، ایک لگن محسوس ہوتی ہے۔" خان صاحب نے شاباش دی۔

"جی ہاں بالکل، اور جذبہ بھی کوئی ایسا ویسا نہیں، بے پناہ جذبہ" جمیل نے بڑے خلوص سے کہا "آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس وقت میرے دل کی کیا کیفیت ہے، میں اپنے آپ میں ساری دنیا سے ٹکرا جانے کا حوصلہ پاتا ہوں۔"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں" خان صاحب نے تائید کی "یہی جذبہ تو تھا کہ ایک مومن سو کافروں پر بھاری پڑتا تھا۔ ملک کو تم جیسے نوجوانوں پر ناز ہے۔ اور تمہارے والدین بھی لائق تحسین ہیں کہ انہوں نے پرورش کا حق ادا کر دیا۔ میں کل صبح ضرور احمد علی بھائی کو مبارک باد دینے جاؤں گا۔"

"ارررے... کہیں ایسا غضب بھی نہ کیجیے گا۔" جمیل گھبرا کر بولا "عورتوں کی طبیعت کو آپ جانتے ہیں اور پھر میں تو امی کا ایک ہی بیٹا ہوں۔ روتے روتے برا حال کر لیں گی۔"

"آئیں، تو کیا تم نے انہیں نہیں بتایا ہے؟" خان صاحب نے پوچھا۔

"صرف امی کو نہیں معلوم ہے۔ میں نے ڈیڈی سے یہی کہا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ بتا دیں اور ڈیڈی نے بھی بڑی مشکل سے اجازت دی ہے۔ ابھی ان کا دل بھرا ہوا ہے، آپ نے ذرا بھی ذکر چھیڑا تو پھٹ پڑیں گے اور کوئی تعجب نہیں کہ مجھے واپس آنے کا تار دے

دیں۔"

"اچھا میاں جاؤ خدا حافظ" خان صاحب نے دعا دی "خدا تمہارا حامی و ناصر ہو اور سلامتی سے واپس لائے۔"

"انکل، ایک دو دن شاید مدینہ میں بھی قیام رہے" جمیل نے قدم اٹھاتے ہوئے کہا "سوچ رہا ہوں کہ خدا نے توفیق دی تو عمرے کی سعادت بھی حاصل کر لوں گا۔"

شاہد کو بڑے زور کی ہنسی آئی مگر ضبط کر گیا، خان صاحب نے غور سے جمیل کی طرف دیکھا۔

"میاں تم مدینہ میں عمرہ کرو گے؟" انہوں نے پوچھا۔ جمیل، شاہد کے ہنسنے اور خان صاحب کے پوچھنے سے سمجھ گیا کہ غلط بات کہہ گیا ہے۔

"اُفوہ، دیکھیے یہ حال ہے جذبات کا کہ کہتا کچھ ہوں اور منہ سے نکلتا کچھ ہے۔ بھلا مجھے کیا معلوم نہیں ہے کہ حج مکہ اور عمرہ جدہ میں کیا جاتا ہے۔"

پھر خان صاحب کو بدستور گھورتے ہوئے دیکھ کر جلدی سے بولا "لاحول ولا قوۃ میرا مطلب ہے کہ حج جدہ میں اور عمرہ مکہ میں کیا جاتا ہے" مگر خان صاحب تو پھر بھی گھور رہے تھے۔

"میں بھی کیا ہوں" جمیل نے گالوں پر تھپڑ مارے "یعنی سیدھی سی تو بات ہے کہ حج اور عمرہ دونوں مکہ میں ادا کیے جاتے ہیں۔ اچھی طرح جانتا ہوں مگر منہ سے نہیں نکلتا۔ اچھا انکل السلام علیکم۔"

اور وہ جلدی سے دروازہ کھول کر نکل گیا۔ شاہد بڑی مشکل سے ہنسی روکے ہوئے اس کے پیچھے تھا۔ خان صاحب اس وقت تک اسے گھورتے رہے جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ پھر بڑے زور سے انہوں نے استغفراللہ کہا اور تسبیح گھماتے ہوئے اندر چلے گئے۔



"تو آپ جہاد کرنے جا رہے ہیں اور جدہ میں عمرہ ادا کریں گے" باہر نکل کر شاہد نے قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

"مولانا میں کسی عربی مدرسہ کا فارغ التحصیل تو ہوں نہیں کہ سارے مسئلہ مسائل زبانی یاد ہوں اور ہوں بھی تو بیشتر باتیں کتاب میں دیکھ کر ہی بتاتے ہیں یعنی داد نہیں دیتے کہ زبانی امتحان دے رہا تھا" جمیل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ویسے جہاں تک جہاد کا تعلق ہے تو میں نے بالکل جھوٹ بھی نہیں بولا تھا۔ تمہیں پتا ہی ہے کہ اس زمانے میں محبت سے بڑا جہاد اور کوئی نہیں ہے۔"

"جی ہاں" شاہد نے سرہلایا "ہر زمانے کے پاگل یہی کہتے چلے آئے ہیں۔"

"مر گئے" جمیل نے گھڑی دیکھی "بھیا پونے گیارہ بج رہے ہیں اور ہم ابھی یہیں کھڑے ہیں۔ جلدی سے کوئی ٹیکسی پکڑو۔ میں نے عذرا سے ٹھیک گیارہ بجے کلب میں ملنے کے لیے کہا تھا۔"

اسی وقت ایک خالی ٹیکسی سامنے سے گزری' شاہد نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ٹیکسی رک گئی۔

"مون لائٹ کلب" جمیل نے جلدی سے دروازہ کھول کر سیٹ پر تقریباً لڑھکتے ہوئے کہا "اور ذرا جلدی۔"

ڈرائیور نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے میٹر ڈاؤن کیا۔ اتنی دیر میں شاہد بھی بیٹھ کر دروازہ بند کر چکا تھا۔ ٹیکسی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ رات کا وقت تھا سڑکیں تقریباً سنسان پڑی تھیں۔ ڈرائیور نے ٹیکسی پوری رفتار سے چھوڑ دی۔ اچانک ایک پیٹرول پمپ کے قریب پہنچ کر اس نے رفتار ہلکی کی اور بریک لگاتے ہوئے اسٹیرنگ پیٹرول پمپ کی طرف موڑ دیا۔

"او بھائی!" جمیل نے گھبرا کر کہا "یہاں کہاں جا رہے ہو؟"

"پیٹرول ختم ہو گیا ہے صاحب!" ڈرائیور نے پمپ کے سامنے ٹیکسی روکتے ہوئے جواب دیا۔

"بھیا یونہی چلتے چلتے رات میں کون پوچھتا ہے" جمیل بولا "میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے بہت جلدی ہے۔"

"ابھی پانچ منٹ میں کلب پہنچائے دیتا ہوں صاحب' آپ گھبراتے کیوں ہیں"

ڈرائیور نے جواب دیا۔

مگر جمیل کے جلدی کرتے کرتے بھی ٹیکسی کلب کے سامنے رکی ہے تو گیارہ بج کر پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ جمیل جلدی سے دروازہ کھول کر اترا۔

"تم یہیں ٹھہرو" اس نے شاہد سے کہا "میں دیکھ کر آتا ہوں۔"

وہ لپکتا ہوا اندر پہنچا۔ اپنے مخصوص کیبن میں جھانکا مگر عذرا وہاں نہیں تھی۔ ہال میں ادھر ادھر دیکھا کسی میز پر نظر نہیں آئی' کاؤنٹر پر آکر بارمین سے پوچھا۔

"مس عذرا تو نہیں آئیں؟"

"جی نہیں' میں نے تو نہیں دیکھا" بارمین نے جواب دیا۔

جمیل چند لمحے کاؤنٹر کے قریب کھڑا سوچتا رہا پھر کوئی خیال آیا اور جلدی سے عقبی حصے میں جا کر اسپورٹ روم میں بھی جھانک آیا مگر عذرا وہاں بھی نہیں تھی۔ گھڑی دیکھی گیارہ بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ گھبرا کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر نکلا' ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ٹیکسی کی طرف چلنے لگا۔

"کیا بات ہے؟" شاہد نے کھڑکی سے منہ نکال کر پوچھا۔

"پتا نہیں عذرا کہیں نظر نہیں آئی" جمیل نے بتایا۔

"کہیں وہ ائرپورٹ نہ چلی گئی ہو" شاہد نے خیال ظاہر کیا۔

"ممکن ہے" جمیل نے سوچتے ہوئے کہا "مشکل یہ ہے کہ اب انتظار کرنے کا وقت بھی تو نہیں ہے تو پھر ائرپورٹ ہی چلا جائے' کیا خیال ہے؟"

"جیسی تمہاری مرضی۔ ظاہر ہے اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہو" شاہد نے جواب دیا۔

جمیل جلدی سے دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

"چلنا بھئی ڈرائیور صاحب ائرپورٹ" اس نے ڈرائیور کو ہدایت کی۔ ڈرائیور نے ٹیکسی بیک کرنا چاہی۔

"آگے آؤٹ گیٹ ہے" شاہد نے بتایا "بیک کرنے کی ضرورت نہیں ہے' سیدھے چلے چلو۔"

ٹیکسی آؤٹ گیٹ سے نکلی۔ جمیل کی نگاہیں بار بار گھڑی کی طرف جا رہی تھیں۔ شاہد نے گھوم کر پچھلی سیٹ کے شیشے سے باہر دیکھا۔ کلب کے دروازے میں ایک ٹیکسی داخل ہو رہی تھی۔ شاہد کو شبہ سا ہوا کہ اس میں عذرا بیٹھی تھی' اس نے جلدی سے منہ دوسری طرف کر لیا۔

ائرپورٹ زیادہ دور نہیں تھا۔ جمیل اپنی گھڑی کے حساب سے گیارہ بج کر بیس منٹ پر ٹیکسی سے اتر کر ہوائی اڈے کے ویٹنگ روم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے اچھی طرح چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھ لیا۔ حد یہ ہے کہ لیڈیز ٹوائلٹ میں بھی جھانک آیا مگر عذرا کا کہیں پتا نہیں تھا۔

"خدا معلوم کیا گڑبڑ ہے" جمیل نے اترے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا "یہاں بھی کہیں دکھائی نہیں دی۔ کہیں ڈاکٹر صاحب کو تو ہمارے پروگرام کی خبر نہیں ہو گئی؟"

"صاحب زادے!" شاہد طنزیہ لہجے میں بولا "مجھ پر رعب تو نہیں جما رہے ہو۔ معلوم ہوتا ہے۔ شرط جیتنے کی خاطر یہ ڈراما کھیلا جا رہا ہے۔"

"بھیا خدا کی قسم اس نے گیارہ بجے کلب میں ملنے کا وعدہ کیا تھا" جمیل نے یقین دلانے کی کوشش کی "میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا معاملہ ہے۔ مجھ سے زیادہ وہ اس بات پر آمادہ تھی۔"

"میں نہیں مانتا" شاہد نے نفی میں سر ہلایا "اس دن مشاعرے میں بھی میں نے ایسی کوئی خاص بات نہیں دیکھی تھی جس سے عذرا کا رجحان تمہاری طرف معلوم ہوتا۔"

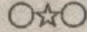
ہاں بھیا' اب تو تم یہی کہو گے" جمیل نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے جواب دیا اور گھڑی دیکھ کر بولا "میرا خیال ہے کہ ایک مرتبہ کلب میں اور دیکھ لیا جائے۔ ابھی وقت ہے۔

وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا ٹیکسی کے قریب پہنچا۔

"واپس کلب چلو" جمیل نے ڈرائیور کو اندر بیٹھتے ہوئے ہدایت کی۔ شاہد نے اس مرتبہ اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے میٹر پر نگاہ ڈالی' چالیس روپے سے اوپر رقم بن چکی تھی۔ ڈرائیور نے ٹیکسی پیچھے گھمائی اور کلب کی طرف چل دیا۔ شاہد نے گھوم کر دیکھا۔ جمیل

ٹیکسی کی چھت پر نگاہ جمائے نہ معلوم کیا سوچ رہا تھا۔

ٹیکسی کلب کے گیٹ میں داخل ہوئی اور ابھی رکی نہیں تھی کہ شاہد نے سامنے کی جانب ایک ٹیکسی کو اسٹارٹ ہو کر کلب کے آؤٹ گیٹ کی طرف جاتے دیکھا اور اگر عذرا کا سراپا اس کے تصور میں واقعی محفوظ تھا تو پھر اس کا یہ خیال غلط نہیں کہا جا سکتا کہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر اس نے جس لڑکی کو بیٹھے دیکھا تھا وہ عذرا ہی تھی۔



"اب۔۔۔؟" شاہد نے جمیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جمیل گارڈن روڈ کے ایک بس اسٹاپ کے ریلنگ پر کہنی ٹکائے کھڑا ہوا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ ائرپورٹ سے واپسی پر دوبارہ اچھی طرح کلب میں عذرا کو تلاش کیا گیا مگر کچھ پتا نہیں چلا' کسی سے پوچھنے کی ہمت اس لیے نہیں پڑ رہی تھی کہ بہرحال تلاش کا مقصد چھپانا تھا۔ دیکھ بھال کر باہر نکلے تو ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ جمیل نے بڑے بور انداز میں ٹیکسی کا بل ادا کیا۔ اب کم سے کم آج کی رات کوئی اور کوشش کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہوائی جہاز یقیناً جا چکا ہو گا۔ جمیل خاموشی سے کلب سے نکل کر گارڈن روڈ کی طرف پیدل چل دیا۔ شاہد اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ کافی دور تک یونہی چلنے کے بعد دونوں ایک بس اسٹاپ پر آ کھڑے ہوئے کیونکہ جمیل کے بقول مفت کے ساٹھ روپے خرچ کر کے یہ بوریت خریدنے کے بعد اگر اسے جنت تک بھی جانا ہوتا تو پیدل ہی جاتا۔

جمیل نے سگریٹ کا ٹوٹا ایک طرف اچھالتے ہوئے کہا "آج کا پانسہ تو الٹا پڑ گیا' کل پھر قسمت آزمائی کریں گے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو جمیل سلمہ جن صاحب کا نام ہے وہ ہار ماننا نہیں جانتے اور وہ بھی لڑکیوں کے معاملے میں۔"

"بس رہنے دو صاحب زادے" شاہد نے جواب دیا "میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ عذرا ان لڑکیوں میں سے نہیں ہے' جنہیں تم اب تک بے وقوف بناتے رہے ہو۔ اس کے برعکس اگر تم نے جو کچھ کہا ہے' اسے سچ مان لیا جائے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس مرتبہ خود تمہیں ایک لڑکی نے الو بنا دیا ہے۔"

"استاد اب تو تم جو چاہو کہہ سکتے ہو" جمیل نے کہا "مگر کل دیکھنا کیا ہوتا ہے۔"

"اچھی بات ہے کل کون سا دور ہے۔ اسے بھی دیکھ لیں گے" شاہد ہنسنے لگا۔

اپنے گھر واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جمیل، شاہد کے ساتھ اسی کے گھر واپس لوٹ آیا۔ خان صاحب سے یہی کہا گیا کہ اطلاع غلط تھی سیٹ آج کے جہاز میں نہیں بلکہ کل کے جہاز میں محفوظ کرائی گئی تھی۔

دوسرے دن جمیل نے نو بجے تک کا وقت بڑی مشکل سے ٹہل ٹہل کر گزارا۔ کئی طرح کے اندیشے اس کے دل میں آ رہے تھے۔ جن میں سب سے خطرناک یہ تھا کہ اگر کہیں ڈاکٹر صاحب نے اس گفتگو کی بنیاد پر عذرا سے باز پرس کر لی ہوگی تو نہ صرف تمام پروگرام چوپٹ ہو سکتا تھا بلکہ بھانڈا بھی ایسا پھوٹے گا کہ کئی گھروں میں اس کی گونج سنائی دے گی۔ بس یہ خیریت رہے تو پھر باقی تمام معاملات سے وہ خاطر خواہ طریقے پر نمٹ سکتا ہے۔

نو بجتے ہی جمیل کو یقین ہو گیا کہ اب ڈاکٹر صاحب اسپتال چلے گئے ہوں گے تو وہ گھر سے نکلا اور سیدھا کوٹھی پہنچ گیا۔ عذرا کا چھوٹا بھائی طارق اسکول جا چکا تھا۔ ملازمہ سے معلوم ہوا کہ عذرا کی طبیعت خراب ہے اور وہ صبح ناشتے میں صرف ایک پیالی چائے اور ایک توس کھانے کے بعد دوبارہ آرام کرنے لیٹ گئی ہے۔ جمیل، عذرا کے کمرے کی طرف چلا۔"

عذرا اپنے پلنگ پر چادر سے منہ لپیٹے پڑی تھی۔ جمیل کمرے میں داخل ہوا۔ دبے پاؤں پلنگ کے قریب پہنچا مگر عذرا سو نہیں رہی تھی۔ آہٹ سن کر اس نے سر اٹھایا۔

"سرکار حسن میں یہ عشق کا غلام آداب بجالاتا ہے" جمیل نے فرشی سلام کرتے ہوئے کہا۔

"آپ...!" عذرا جیسے ایک دم کھل اٹھی مگر فوراً ہی اس کے چہرے پر غبار چھا گیا۔ وہ آہستہ سے پلنگ سے اتری لباس درست کیا اور منہ پھیر کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے تازہ اخبار اٹھا لیا۔

جمیل نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ اتنے زور سے کہ عذرا نے یقیناً سن لیا ہوگا۔

مرحلے ضبط کے دشوار ہوئے جاتے ہیں
اشک پلکوں کے لیے بار ہوئے جاتے ہیں

جمیل نے ترنم سے پڑھا۔

عذرا بدستور منہ چھپائے ہوئے اخبار پڑھتی رہی۔ جمیل نے پھر ایک زوردار ٹھنڈی سانس بھری۔

کتنے بیگانہ اخلاص ہیں دنیا والے
ہم وفا کر کے گنہگار ہوئے جاتے ہیں

جمیل نے دوسرا شعر پڑھا اور عذرا کے ہاتھوں سے اخبار چھوٹ کر صوفے پر گر پڑا۔"

"پھر پڑھیے" وہ والہانہ انداز میں بولی۔

کتنے بیگانہ اخلاص ہیں دنیا والے
ہم وفا کر کے گنہگار ہوئے جاتے ہیں

جمیل نے بہت جھوم کر دوسری مرتبہ شعر پڑھا اور ساتھ ہی مقطع بھی۔

بن گیا جبر مشیت میری قسمت شاہد
پھول چنتا ہوں مگر خار ہوئے جاتے ہیں

"مشیت کو الزام کیوں دے رہے ہیں" عذرا نے کہا "آپ خود ہی وعدے کے مطابق کلب نہیں پہنچے۔"

"جیسے آپ بہت پہنچی تھیں؟"

"جناب دو مرتبہ ائرپورٹ اور کلب کے چکر لگانے کے بعد گھر واپس آئی ہوں۔"

"اور میں قسم کھا سکتا ہوں کہ ٹھیک گیارہ بج کر پانچ منٹ پر کلب پہنچ گیا تھا مگر تمہارا وہاں دور دور پتا نہیں تھا۔ پھر سوچا میں پانچ منٹ لیٹ ہو گیا ہوں اس لیے کہیں تم ائرپورٹ نہ چل دی ہو مگر وہاں کا جانا بھی بیکار ہی ثابت ہوا پھر واپس کلب آیا اور پھر مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ مجبوراً ایک گھنٹے تک سڑکوں پر آوارہ گردی کر کے اپنا غم غلط کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہوا گھر واپس چلا گیا۔"

"میں کیسے یقین کرلوں جبکہ میں گیارہ سے پہلے کلب پہنچ چکی تھی" عذرا نے بتایا

"گیارہ بجنے میں شاید دس بارہ منٹ تھے کہ کسی نے دوران گفتگو بتایا کہ فیروز آباد جانے والا ہوائی جہاز تو گیارہ بجے جا رہا ہے۔

"میں گھبرا کر سیدھی ائرپورٹ بھاگی کہ شاید آپ بھی وہاں پہنچ چکے ہوں۔ آپ تو ملے نہیں مگر یہ معلوم ہو گیا کہ بات غلط ہے' ہوائی جہاز ساڑھے بارہ بجے ہی جائے گا۔ میں گھبرا کر کلب آئی ادھر ادھر دیکھا لیکن آپ کہیں نظر نہیں آئے۔"

"تم ائرپورٹ سے دوبارہ کس وقت واپس کلب پہنچی تھیں۔" جمیل نے پوچھا۔

"میری گھڑی میں گیارہ بج کر ایک یا دو منٹ ہوئے تھے۔" عذرا نے بتایا۔

"اور اس کے بعد کب تک وہاں رہیں؟"

"ساڑھے گیارہ بجے تک۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمہیں گیارہ بج کر پانچ منٹ پر جبکہ میں وہاں پہنچا تھا موجود ہونا چاہیے تھا۔" جمیل نے چونک کر کہا۔

"میں وہیں موجود تھی' آپ ہی نہیں آئے۔"

"ارے بھئی' میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ ٹھیک گیارہ بج کر پانچ منٹ پر میں اپنے مخصوص کیبن میں جھانک رہا تھا" جمیل بولا "یقین نہیں آتا...۔ تو ایک گواہ بھی موجود ہے کلب کا بارمین تمہیں بتا دے گا کہ میں آیا تھا یا نہیں؟"

"کیبن میں تو میں البتہ نہیں بیٹھی تھی" عذرا نے جواب دیا "لیکن اگر آپ آئے ہوتے تو مجھے لامحالہ نظر آنا چاہیے تھے۔ میں ہال میں دروازے کے قریب پہلی میز پر بیٹھی تھی اور میری نظریں مسلسل باہر کی طرف لگی رہی تھیں۔"

"اور میں نے خود ہال میں ادھر ادھر گھوم پھر کر تمام میزیں دیکھی تھیں اگر تم وہاں بیٹھی تھیں تو ضرور جادوئی سرمہ لگا کر بیٹھی ہوگی۔"

"اور آپ اگر واقعی کلب گئے تھے تو ضرور سلیمانی انگوٹھی پہن کر گئے ہوں گے" عذرا بولی۔

"ایک منٹ" اچانک جمیل نے چونک کر ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "ذرا بتاؤ تو اس وقت

تمہاری گھڑی میں کیا بجا ہے۔"

"کیوں؟" عذرا نے اپنی کلائی پر نگاہ ڈالی "دس بج کر دس منٹ ہوئے ہیں۔"

"اور میری گھڑی میں دس بج کر چالیس منٹ ہوئے ہیں" جمیل نے اچھلتے ہوئے کہا

"بس سمجھ میں آگیا سارا چکر۔ کل صبح اٹھ کر تکیہ کے نیچے سے گھڑی نکالی تو بند معلوم ہوئی۔ دیکھا تو چابی دینا بھول گیا تھا۔ میں نے چابی تو بھر دی مگر سوچا کہ ریڈیو پر خبریں ہوں گی تو ٹائم ملا لوں گا۔ پھر یہ بات ہی ذہن سے نکل گئی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ میری اور تمہاری گھڑیوں میں آدھے گھنٹے کا فرق پیدا ہو گیا۔"

"یعنی میں ناحق ہی آپ سے بدگمان ہو رہی تھی" عذرا خوش ہو گئی۔

"جی ہاں۔ اور خدا کا شکر ہے کہ تمہاری غلط فہمی دور ہو گئی ورنہ مجھے بھی شاید غالب کی طرح یہ کہنا پڑتا کہ۔

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

"خدا نہ کرے" عذرا جلدی سے بولی اور جمیل کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ جمیل نے شرارت سے ہاتھوں پر پیار کر لیا اور عذرا کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیل گئی۔

"تو پھر اب کیا کیا جائے؟" سر جھکائے ہوئے بولی۔

"کچھ نہیں۔ میں ائرپورٹ جا کر ٹکٹ کی تاریخ بدلوائے لیتا ہوں۔ کل نہیں جا سکے تو آج چلیں گے۔ تم نے سنا نہیں شکیل بدایونی صاحب فرماتے ہیں۔

ہم نہیں اے ہم نشیں منت کش فصل بہار
ہے شگفتہ گل سے مطلب کوئی بھی موسم سہی

"مگر خدا کے لیے آج تو کوئی گل نہ کھلائیے گا" عذرا مسکراتے ہوئے بولی۔

"لاؤ اپنی گھڑیاں ملائے لیتے ہیں" جمیل نے کہا اور گھڑی درست کر لی۔

"ایک بات اور میں آج کلب میں نہیں ملوں گی" عذرا نے کہا "خواہ مخواہ لوگوں کو شبہ ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے تم گیارہ بجے ائرپورٹ پہنچ جانا" جمیل نے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر جیسے

چونک کر بولا "اور ہاں یہ بتاؤ ڈاکٹر صاحب کو تو کوئی شبہ نہیں ہوا؟"

"نہیں انہیں کیوں کوئی شبہ ہوتا۔ کلب میں جاتی ہی رہتی ہوں۔"

"اور نہ انہوں نے تم سے کوئی گفتگو کی؟"

"گفتگو تو نہیں کی مگر میں اسی دن سے ان کا طرز عمل بدلا ہوا محسوس کر رہی ہوں۔ میری بات کا یا تو جواب نہیں دیتے یا بڑی رکھائی سے بات کرتے ہیں، صبح کا ناشتا بھی اپنے کمرے میں منگوانے لگے ہیں۔"

"اچھی بات ہے تو پھر میں چلتا ہوں۔"

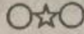
"سیٹ ریزرو ہو جائے تو مجھے ائرپورٹ سے فون کر دیجئے گا۔ مزید اطمینان ہو جائے گا" عذرا نے کہا۔

جمیل نے وعدہ کیا اور خدا حافظ کہتا ہوا کوٹھی سے نکل آیا۔ ٹیکسی کر کے ائرپورٹ پہنچا مگر معلوم ہوا کہ آج رات جانے والے ہوائی جہاز میں کوئی سیٹ خالی نہیں ہے اور آج کے بعد پھر دو دن چھوڑ کر جہاز جائے گا" جمیل نے ٹکٹ کینسل کرائے اور ائرپورٹ سے ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا، ٹائم ٹیبل پوچھا تو پتا چلا کہ ایک میل ٹرین رات کے بارہ بج کر بیس منٹ پر فیروز آباد کے لیے روانہ ہوتی ہے۔ جمیل نے فرسٹ کلاس میں دو سیٹیں ریزرو کرائیں اور وہیں ریلوے اسٹیشن سے فون کر کے عذرا کو پروگرام کی خبر دی۔ اسے بتادیا کہ اب روانگی جہاز سے نہیں ٹرین سے ہو رہی ہے اور یہ کہ وقت بھی بارہ بج کر بیس منٹ کا ہے۔ فرسٹ کلاس میں سیٹ ریزرو کرالی ہے۔ وہ ٹھیک پونے بارہ بجے اسٹیشن پہنچ جائے۔

اور پھر جب دوپہر کو جمیل نے شاہد کو بتایا کہ کل عذرا کے نہ ملنے کا سبب یہ تھا کہ اس کی گھڑی نصف گھنٹا آگے تھی اور یہ کہ اس کے آگے ہونے کی کیا وجہ تھی تو شاہد نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جمیل اور عذرا دونوں اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنے کی عجلت میں یہ بات نظر انداز کر گئے کہ اگر جمیل کی گھڑی چابی نہ ہونے کی وجہ سے بند ہو گئی تھی تو اسے سست ہونا چاہیے تھا نہ کہ تیز۔ ویسے شاہد کو اس اتفاق پر بھی تعجب تھا کہ جمیل کی گھڑی بھی اسی دن بند ہونا تھی جس دن اس نے گھڑی کو تیز کیا تھا اگر یہ نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ جمیل اپنی گھڑی تیز پا کر شاہد پر شبہ کرنے لگتا۔ مگر بند ہونے کے باوجود جب شاہد نے گھڑی ملائی تھی

تو جمیل کی گھڑی اس کی اپنی گھڑی سے صرف دو منٹ پیچھے تھی اس کا مطلب یہی سمجھا جاسکتا تھا کہ گھڑی ایک دو منٹ پہلے ہی بند ہوئی ہوگی۔

اس کے بعد جب جمیل نے تازہ پروگرام سے شاہد کو آگاہ کیا تو اس کے لیے ایک نئی الجھن پیدا ہو گئی۔ اسے بہرحال اپنی سی کوشش کرنا تھی کہ جمیل عذرا کو ساتھ نہ لے جاسکے مگر یہ کس طرح ممکن ہو گا یہ شاہد کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔



طے یہ ہوا کہ کل کی طرح آج بالکل عین وقت پر روانہ نہیں ہوں گے کہ اگر کوئی بات ہو تو اس کا تدارک کرنے کا وقت بھی نہ ملے۔ چنانچہ جمیل اور شاہد گھر سے گیارہ بجے روانہ ہوئے۔ ٹیکسی فوراً ہی نہیں ملی، اس لیے ساڑھے گیارہ سے پہلے اسٹیشن نہیں پہنچ سکے۔ جمیل نے ازراہ احتیاط ایک مرتبہ پھر میل ٹرین کا وقت معلوم کیا، وہی بارہ بج کر بیس منٹ پر روانگی تھی یہ بھی معلوم ہوا کہ میل ٹرین چونکہ یہیں سے بن کر جاتی ہے اس لیے پلیٹ فارم پر آنے سے پہلے بھی اس کی بوگیاں اور ڈبے شیڈ میں کھڑے رہتے ہیں۔

"بھئی جب تم نے سیٹیں ریزرو کرالی ہیں تو اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہو؟" شاہد نے کہا۔

"سیٹیں تو ریزرو کرالی ہیں مگر میں سوچ رہا تھا کہ ہم دونوں اسٹیشن پر جتنا کم نظر آئیں بہتر ہے" جمیل نے سوچتے ہوئے کہا۔

"کیوں جناب، ہم دونوں اگر زیادہ نظر آئیں گے تو کیا قیامت ہو گی" شاہد نے پوچھا۔

"اُفوہ یار، تم میرا مطلب نہیں سمجھے، میں اپنی اور عذرا کی بات کر رہا ہوں۔" جمیل نے کہا "ہوائی جہاز کی بات اور تھی۔ وہاں گنے چنے آدمی ہوتے ہیں اور سب نہیں تو زیادہ تر اپنے آپ میں مگن ہوتے ہیں۔ چنانچہ کوئی ہماری طرف توجہ بھی نہیں کرتا مگر یہاں پلیٹ فارم پر ہزاروں آدمی موجود ہوں گے۔ فرض کرو کہ ڈاکٹر صاحب نے بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ وغیرہ کر دی تو اسٹیشن کے ہزار آدمی گواہی دیں گے کہ ہم نے جاتے دیکھا تھا۔ پہچاننے والی آنکھیں ایک نہ دو پوری دو ہزار ہوں گی۔ اسی لیے میں سوچ رہا تھا کہ اگر کسی طرح پہلے سے بیٹھنے کا انتظام ہو جائے تو کیا بات ہے؟"

"تو پھر شیڈ میں بوگیاں کھڑی ہوں گی۔ جا کر بیٹھ جاؤ۔"

"سلام حضور" ایک قلی نے قریب آکر سلام کیا "سامان اٹھا کر لے چلوں صاحب!" اس نے اکلوتے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔

"سامان" جمیل نے قلی کی طرف دیکھا "یہ تمہیں سامان نظر آرہا ہے' ایک سوٹ کیس ہی تو ہے' خود اٹھا کر لے جا سکتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے صاحب مگر جگہ وگہ کی پریشانی تو ہوتی ہے نا میل ٹرین میں" قلی نے جواب دیا "ایک دم فرسٹ کلاس سیٹ دلوا دوں گا اور سب سے پہلے۔"

"سب سے پہلے کس طرح؟"

"آپ کو شیڈ میں لے جا کر بٹھا دوں گا بوگی میں" قلی نے دور شیڈ کی طرف ہاتھ اٹھا کر بتایا۔

"بھئی واہ میاں! تم تو اس وقت بالکل فرشتہ رحمت کی طرح آگئے' بولو کیا لوگے اس سامان کا؟" جمیل نے مسکرا کر سوٹ کیس کی طرف دیکھا۔

"ایک بات بول دوں صاحب' بیس روپے ہوں گے۔"

"بیس روپے!" جمیل نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں "اماں تم سیٹ تک پہنچانے کی مزدوری مانگ رہے ہو یا فیروز آباد تک کا کرایہ۔"

"بابو جی اصل فاصلہ تو یہاں سے سیٹ تک کا ہی ہے۔" قلی نے فلسفیانہ انداز میں کہا "ورنہ کھڑکی سے ٹکٹ تو سب ہی لے آتے ہیں۔"

"واہ' بڑے میاں کہیں سقراط بقراط کی جانشینی تمہارے ہی حصے میں تو نہیں آئی" جمیل نے جواب دیا "اچھا دیکھو' ایک بات ہم بھی کہے دیتے ہیں' روپے دس ملیں گے۔ سیٹ ہماری فرسٹ کلاس میں پہلے سے ریزرو ہے۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ ہمیں شیڈ میں لے جا کر اس بوگی میں بٹھا دو' جو فرسٹ کلاس ہو' جس پر ہمارے نام کی چٹ لگی ہوئی ہو... بس۔"

"تو بابو جی' آپ نے پہلے ہی کیوں نہیں بتایا کہ آپ کی سیٹیں ریزرو ہیں" قلی نے سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے کہا "آیئے بس ناک کی سیدھ میں میرے پیچھے چلے آیئے۔"

"بھئی دونوں باتیں تو ایک ساتھ ہونا مشکل ہیں۔ کہیں ناک کی سیدھ بدل جائے گی اور کہیں تمہارا پیچھا" جمیل مسکراتے ہوئے بولا مگر قلی کی سمجھ میں شاید یہ بات نہیں آئی۔ وہ چپ چاپ سوٹ کیس سر پر اٹھائے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا شیڈ کی طرف جا رہا تھا۔ جمیل اور شاہد اس کے پیچھے چل دیئے۔

شیڈ میں بالکل اندھیرا تھا۔ پلیٹ فارم پر جلتی ہوئی لائٹوں کی روشنی بہت ہی ہلکی ہو کر یہاں تک پہنچ رہی تھی اور صرف بوگیوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ پہچاننے میں مدد دینے کے سوا کسی اور کام کی نہیں تھی' اگر قلی ساتھ نہ ہوتا تو جمیل اور شاہد کبھی بھی ٹرین کی بوگیاں تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ قلی نے کئی ڈبوں اور بوگیوں کو الانگتے پھلانگتے جمیل کو ایک لمبی سی قطار کے آخر میں لگے ہوئے فرسٹ کلاس کے ڈبے کے سامنے لا کھڑا کیا۔ دروازے کے ساتھ لگی ہوئی لوہے کی باری کے اوپری سرے پر ایک ریزرویشن کارڈ لوہے کے تار کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ جمیل نے جیب سے لائٹر نکال کر جلایا اور اس کی روشنی میں کارڈ پڑھنے کی کوشش کی' کارڈ پر مسٹر اینڈ مسز شاہد لکھا ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے میاں" جمیل نے اطمینان سے سر ہلایا "یہی ڈبا ہے۔"

وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ قلی نے سر پر اٹھایا ہوا سوٹ کیس برتھ پر رکھ دیا۔

"یہاں تو بڑا اندھیرا ہے میاں!" جمیل بولا "لائٹ کب تک آجائے گی۔"

"بس ابھی کچھ دیر میں انجن آکر لگے گا اور اس کے لگتے ہی روشنی بھی آجائے گی" قلی نے جواب دیا۔

"اچھا بھئی یہ تو ہوا" جمیل نے شاہد کو مخاطب کر کے کہا "اب ذرا یہ بتاؤ گھڑی میں ٹائم کتنا ہے۔"

"پونے بارہ بجے ہیں" شاہد نے بتایا۔

"ارے باپ رے" جمیل نے گھبرا کر اپنی گھڑی دیکھی "واقعی یہ تو پونے بارہ ہی بجے ہیں۔ وہاں پلیٹ فارم پر اگر عذرا آگئی ہوگی تو پھر مجھے کوس رہی ہوگی۔"

وہ قلی کی طرف گھوما۔

"بڑے میاں تم پندرہ بیس منٹ کے لیے یہاں ٹھہر جاؤ۔" اس نے کہا "تو میں ذرا پلیٹ فارم پر جا کر اپنی بیوی کو دیکھ لوں۔"

"آپ جائیں بابو جی' میں یہاں بیٹھا ہوں۔" قلی نے جواب دیا۔

"تمہارا نمبر کیا ہے" جمیل نے ازراہ احتیاط پوچھ لیا۔

"اٹھارہ سو بہتر ہے صاحب!" قلی نے بتایا۔

جمیل شاہد کو ساتھ لے کر بڑی احتیاط سے واپسی کا راستہ نگاہ میں رکھتے ہوئے پلیٹ فارم کی طرف چلا اور جیسا کہ اس کا خیال تھا عذرا واقعی فرسٹ کلاس لیڈیز ویٹنگ روم کے سامنے کھڑی ہوئی پریشان نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے صرف ایک ہلکا سا اٹیچی کیس ہاتھ میں لیا ہوا تھا۔ جمیل کو دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ تیز قدموں سے اس کی جانب بڑھی۔ شاہد کچھ پیچھے تھا۔ اس لیے وہ ابھی تک اسے نہیں دیکھ سکی تھی۔

"خدا کا شکر ہے" عذرا نے جمیل کا بڑھا ہوا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "آپ نظر تو آئے' میں کب سے آپ کو تلاش کر رہی تھی۔"

اور پھر اسی لمحے اس نے شاہد کو بھی دیکھ لیا۔ وہ بے اختیار چونک پڑی۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے" جمیل نے اس کی گھبراہٹ دیکھتے ہوئے کہا "جمیل میرا دوست ہے اور اس سے میرا کوئی راز چھپا ہوا نہیں ہے۔"

"آداب عرض کرتا ہوں" شاہد نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"آداب!" عذرا نے پیشانی پر ہاتھ مارا اور پھر جمیل کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"آپ تو کہہ رہے تھے کہ ٹرین بارہ بج کر بیس منٹ پر روانہ ہو گی مگر میں ابھی ٹائم ٹیبل دیکھ کر آئی ہوں' وہاں تو ایک بجے کا وقت لکھا ہوا ہے۔"

"تم نے تھرٹین اپ ٹرین دیکھی تھی" جمیل نے پوچھا۔

"گویا آپ کے خیال میں مجھے ٹائم ٹیبل بھی دیکھنا نہیں آتا؟"

"مگر میں تو ابھی جمیل کے ساتھ خود دیکھ کر آیا تھا کہ ٹرین رائٹ ٹائم تھی۔"

"ارے بھائی تو ایک ہی بجے سہی کیا فرق پڑتا ہے۔" شاہد نے کہا۔

عذرا کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ دانستہ شاہد کو نظرانداز کر رہی ہے۔

"آپ نے سیٹ تو دیکھ لی ہو گی" وہ بدستور جمیل سے مخاطب تھی۔

"ہاں آؤ چلو وہیں بیٹھتے ہیں" جمیل نے کہا اور سب شیڈ کی طرف واپس چلے۔ قلی ان کا انتظار کر رہا تھا۔

"آ گئے بابو جی" اس نے کہا "بیگم صاحبہ مل گئیں۔"

"ہاں بھئی مل گئیں" جمیل نے مسکرا کر عذرا کی طرف دیکھا۔

"یہاں تو بڑا اندھیرا ہو رہا ہے" عذرا نے کہا۔

"اب کہاں' پہلے البتہ ہو رہا تھا۔ جمیل شوخ لہجے میں عذرا کو چھیڑتے ہوئے بولا۔

"کہاں بابو جی' ابھی انجن تو لگا ہی نہیں" بڑے میاں نے ڈبے کے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔

جمیل نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا' اس وقت وہ بہت خوش تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بے اختیار ہنستا چلا جائے۔ شاہد بے انتہا سنجیدہ اور عذرا کچھ گھبرائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"بابو جی' اپنی مزدوری مل جاتی تو اچھا تھا۔"

"ہاں بھئی ضرور" جمیل نے جیب سے پرس نکالا اور دس کا ایک نوٹ نکال کر قلی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ قلی نے نوٹ جیب میں رکھا اور ڈبے سے اتر کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

"یہاں پانی تو ہو گا نہیں" عذرا' جمیل سے مخاطب تھی۔

"میں ابھی لاتا ہوں" شاہد نے کھڑکی کے پاس سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کوئی بوتل ووتل لے آنا" جمیل نے رائے دی۔

"وھسکی یا شیمپین" شاہد نے پوچھا۔

"بھیا' سب سے بڑی شراب ہے محبت اور وہ میں نے خوب چڑھا رکھی ہے" جمیل ہنستے ہوئے بولا "تم تو بس کوئی کوکا کولا وغیرہ لے آنا۔"

شاہد ڈبے سے اترا تو عذرا نے کھڑکی سے جھانک کر اسے دیکھا۔

"آپ جمیل صاحب کو ساتھ کیوں لے آئے؟" اس نے پوچھا۔

"بھئی، میں نے بتایا کہ وہ میرا بہترین دوست ہے" جمیل نے جواب دیا "کہیں تمہارا یہ خیال تو نہیں ہے کہ وہ واپس جا کر سب کو بتا دے گا؟"

"نہیں۔ بس یونہی ان کا آنا اچھا نہیں معلوم ہوا" عذرا اس فقرے سے زیادہ اپنے جذبات کی وضاحت نہیں کر سکی۔

تھوڑی دیر میں شاہد سیون اپ کی تین بوتلیں لے کر آ گیا۔ بوتلیں پی گئیں، کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں اور شاہد نے رخصت کی اجازت چاہی۔

"اچھا دوست دعا کرنا کہ خیریت سے پہنچ جائیں اور آئندہ بھی خیریت سے ہی رہیں۔"

"ضرور، میری بہترین دعائیں تمہارے ساتھ ہیں" شاہد نے جواب دیا، خالی بوتلیں اٹھائیں اور ڈبے سے اتر گیا۔

اس کے جانے کے بعد چند لمحے تک جمیل اور عذرا خاموش رہے۔

"ابھی تو صرف سوا بارہ بجے ہیں" جمیل نے اپنی گھڑی دیکھی "میرا خیال ہے، تم لیٹ کر آرام کرو۔ میں جاگ رہا ہوں۔"

"مجھے کچھ نیند بھی آ رہی ہے" عذرا نے جواب دیا اور برتھ کے ہتھے پر سر رکھتے ہوئے لیٹ گئی۔

جمیل نے جاگنے کا وعدہ تو کر لیا تھا مگر جلد ہی وہ بھی اندھیرے میں خاموش اور تنہا بیٹھے بیٹھے غنودگی محسوس کرنے لگا۔ اس نے گھڑی دیکھی صرف ساڑھے بارہ بجے تھے۔ بھاری قدموں سے اٹھ کر اس نے ڈبے کے دونوں دروازے بند کئے اور اپنی برتھ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ گہری نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

جمیل کو ٹھیک طرح سے یاد نہیں کہ وہ کتنی دیر تک سویا۔ مگر جب اس کی آنکھ کھلی تو کہیں قریب سے کسی مرغ کے بانگ دینے کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔ ایک دم چونک کر اس نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی، پونے چار بج رہے تھے۔ سامنے کی برتھ پر عذرا پرسکون گہری نیند میں ڈوبی ہوئی ابھی تک اسی پہلو پر سو رہی تھی اور ٹرین شاید کسی اسٹیشن پر کھڑی تھی کیونکہ جمیل کو کسی حرکت کا احساس نہیں ہوا۔

ایک انگڑائی لیتے ہوئے اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور ایک دم گھبرا گیا۔ ڈبا تو

ابھی تک شیڈ ہی میں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے عذرا کو جگایا۔

"معلوم ہوتا ہے آج ٹرین ضرورت سے زیادہ لیٹ ہے۔" اس نے کہا "تم ٹھہرو میں ابھی معلوم کر کے آتا ہوں۔"

"جی نہیں۔ مجھ سے اس اندھیرے میں اکیلا نہیں بیٹھا جائے گا۔ میں بھی آپ کے ساتھ ہی آتی ہوں۔"

"اور سامان جو اکیلا رہے گا؟"

"آپ کے سیٹ کیس میں کوئی قیمتی چیز تو نہیں ہے؟" عذرا نے پوچھا۔

"جی نہیں ساری قیمتی چیزیں میں اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔" جمیل نے سینے والی جیب کی طرف اشارہ کیا "یہاں۔"

"تو پھر اسے یہیں چھوڑ دیں۔ میں اٹیچی اٹھائے لیتی ہوں، اس میں میرے زیورات ہیں" عذرا نے کہا۔

"جب تمہارا بوجھ اٹھا لیا ہے تو لاؤ اب تمہاری اٹیچی کو بھی اٹھا لوں" جمیل نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

جمیل نے ایک ہاتھ سے اٹیچی اٹھائی اور دوسرے ہاتھ سے عذرا کو سہارا دے کر نیچے اتارا۔ پھر خود بھی اترا۔ دونوں بوگیوں کی قطار کے درمیان سے گزرتے ہوئے شیڈ سے نکل کر پلیٹ فارم پر آ گئے۔ سامنے ہی ایک ٹی سی سفید وردی پہنے جا رہا تھا۔ جمیل اور عذرا قدم بڑھا کر اس کے قریب پہنچے۔

"کیوں بھائی صاحب!" جمیل نے پوچھا "تھرٹین اپ ٹرین کتنی لیٹ ہے؟"

ٹی سی نے رک کر بڑے غور سے جمیل کی طرف دیکھا۔

"جناب، آپ کہاں کی باتیں کر رہے ہیں؟" وہ بولا "تھرٹین اپ تو ایک بجے جا چکی ہے۔"

"جی!" جمیل کی زبان سے نکلا اور اٹیچی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ فارم کے سنگین فرش پر گر پڑی۔

"یہ کیا مذاق ہے صاحب" وہ سنبھل کر بولا "میں اور میری وائف تھرٹین اپ کی

فرسٹ کلاس بوگی میں رات کے بارہ بجے سے بیٹھے ہوئے انتظار کر رہے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ ٹرین چلی گئی اگر ٹرین چلی گئی تو وہ ڈبا اس سے کیوں نہیں لگایا گیا؟"

"میرا خیال ہے آپ کسی غلط ڈبے میں بیٹھ گئے ہوں گے" ٹی سی نے جواب دیا۔

"غلط ڈبا؟" جمیل نے تیزی سے کہا "قبلہ' اس پر میں اپنی آنکھوں سے ریلوے ریزرویشن کارڈ دیکھ چکا ہوں۔"

"ممکن ہے وہ کسی اور کے نام ریزرو ہو اور کسی اور ٹرین کا ہو" ٹی سی بولا "آپ دیکھتے ہیں۔"

اور جب جمیل ٹی سی کے ساتھ شیڈ میں واپس آیا تو ایک انجن اس ڈبے کو کہیں لیے جا رہا تھا۔ ٹی سی نے ڈرائیور کو آواز دے کر بوگی رکوائی ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کی روشنی ریزرویشن کارڈ پر ڈالی۔

"کیا نام ہے آپ کا؟" ٹی سی نے پوچھا۔

"شاہد۔ ریزرویشن مسٹر اینڈ مسز شاہد کے نام سے تھا" جمیل نے غصے سے جواب دیا۔

"اور کارڈ پر لکھا ہے۔ مسٹر اینڈ مسز زاہد" ٹی سی طنزیہ لہجے میں بولا "شاید آپ نے غور سے نہیں پڑھا۔"

جمیل نے آگے بڑھ کر کارڈ دیکھا۔ وہاں واقعی واضح طور پر مسٹر اور مسز زاہد علی لکھا ہوا تھا۔ چوٹ ہو چکی تھی۔ اب کیا کہتا' خاموشی سے ڈبے میں گیا اور اپنا سوٹ کیس اتار لیا۔

O☆O

"ایسا معلوم ہوتا ہے" جمیل نے ایک اور ٹھنڈی سانس بھری "کچھ تقدیر بھی ہمارے خلاف سازش کر رہی ہے۔ میں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ۔

بن گیا جبر مشیت میری قسمت شاہد
پھول چنتا ہوں مگر خار ہوئے جاتے ہیں

مگر ان عارضی ناکامیوں سے ہمت ہارنے والا نہیں ہوں۔ آج ہم تیسری بار کوشش کریں گے اور آج کی رات میں دیکھوں گا کہ اتفاقات کس طرح ہمارا راستہ روکتے ہیں۔

بقول داغ صاحب۔

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کردوں تو داغ نام نہیں

O☆O

"مگر یہ تو بتاؤ واپسی پر کسی نے دیکھا تو نہیں تھا؟"

جمیل اور عذرا اس وقت گھر میں لان پر بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ وہ امنگ وہ چمک جو کل عذرا کے چہرے پر نظر آ رہی تھی' آج غائب تھی۔ آنکھیں کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں اور لب و لہجے سے افسردگی عیاں تھی!

"میں پچھلے دروازے سے گئی تھی" اس نے جواب دیا "ابا جان کا کمرہ دوسری طرف ہے۔ اس کے علاوہ وہ ساڑھے پانچ چھ بجے سے پہلے سو کر نہیں اٹھتے اور میں ساڑھے چار بجے گھر واپس پہنچ گئی تھی۔"

"تم کہیں اتفاقات سے گھبرا کر ہمت تو نہیں ہار گئیں؟" جمیل نے پوچھا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں" عذرا نے جواب دیا "مگر خواہ مخواہ ایک وہم سا دل میں پیدا ہو رہا ہے کہ شاید قسمت ہمارے ساتھ نہیں ہے۔"

"یہ قسمت' یہ تقدیر۔ یہ بھی تو سماج کا بنایا ہوا ایک ہوا ہے۔" جمیل نے پرجوش لہجے میں کہا "آدمی اپنی تقدیر خود بناتا ہے۔ علامہ اقبال نے خوب کہا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اور تم جانتی ہو کہ محبت کے بغیر خودی بلند نہیں ہو سکتی' مجھے یقین ہے کہ تم ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہراساں نہیں ہو گی۔"

"نہیں خیر۔ ڈرتی تو نہیں ہوں مگر ہم فیروز آباد کے بجائے کہیں اور کیوں نہ چلیں؟"

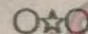
"یہ بات ہے تو پھر چلو تغلق آباد چلتے ہیں۔ وہ یہاں سے ذرا دور بھی ہے۔" جمیل نے کہا "مگر وہاں ہوائی جہاز نہیں جاتا' ٹرین سے ہی جانا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے' ہم وہیں جائیں گے" عذرا خوش ہوتے ہوئے بولی۔

"بس تو پھر آٹھ بجے شام کو اسٹیشن پر پہنچ جانا" جمیل نے اٹھتے ہوئے کہا "میں جا کر سیٹیں بک کرائے لیتا ہوں۔"

"آپ تو اس طرح ٹائم بتا رہے ہیں جیسے وہاں جاتے رہے ہوں" عذرا نے پوچھا۔

"جاتا تو نہیں رہتا مگر سروس کے سلسلے میں جانے والا تھا۔ بس جاتے جاتے رہ گیا۔" جمیل نے بتایا "اسی سلسلے میں ابا جان کو بتانے کے لیے کہ ٹرین کب جاتی ہے ریلوے ٹائم ٹیبل دیکھنا پڑا تھا۔ بہرحال یہ قصہ پھر کبھی سناؤں گا۔ اب چلتا ہوں' تم ٹھیک آٹھ بجے اسٹیشن پر پہنچ جانا۔ ٹرین آٹھ بج کر سینتیس منٹ پر چھوٹتی ہے۔"



"السلام علیکم چچا جان!" شاہد نے دکان پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام" علی احمد صاحب نے بہی کھاتے میں کچھ لکھتے ہوئے جواب دیا اور پھر نگاہ اٹھا کر دیکھا "ارے شاہد بیٹے تم! کہو خیریت تو ہے۔"

"جی ہاں' بس آپ بزرگوں کی دعائیں ہیں۔"

"آؤ بیٹھو" احمد علی صاحب نے کہا "تم نے تو شاید بی اے پاس کر لیا ہے۔ کہیں نوکری ووکری ملی کہ نہیں؟"

"جی ہاں۔ آپ کی دعا اور خدا کی مہربانی سے بڑی اچھی ملازمت مل گئی ہے۔" شاہد نے جواب دیا۔

"کہہ تو وہ نالائق بھی رہا تھا کہ اسے کوئی ملازمت مل گئی ہے تین ہزار روپے کی" احمد علی صاحب نے کہا "تمہیں تو معلوم ہوگا۔"

"جی ہاں" شاہد نے قصداً تفصیل میں جانے سے گریز کیا۔

"اچھا بیٹے' کیا ملازمت کے لیے نقد ضمانت بھی دی جاتی ہے؟ مجھ سے پورے دس ہزار ضمانت کے نام پر لے گیا ہے" احمد علی صاحب نے کچھ غصے سے کہا "اگر اس کی ماں نے زور نہ دیا ہوتا تو میں کبھی بھی اتنی بڑی رقم اس کو نہ دیتا۔ بس یہی سوچ کر چپ ہو گیا کہ نہ جانے کون سی نیک ساعت میں برخوردار کو نوکری کرنے کا خیال آگیا ہے ورنہ مجھے تو یہی خطرہ تھا کہ کہیں بھائی اختر سے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ وہ تو ایسا شریف آدمی ہے کہ شاید

اپنے منہ سے کچھ بھی نہ کہتا مگر میں فوزیہ کو اپنی بیٹی کی طرح چاہتا ہوں' یہ کس طرح گوارا کر سکتا تھا کہ صاحب زادے نکھٹو کے نکھٹو رہیں اور میں اس بے زبان بچی کو ان کے پلے باندھ کر اس کی قسمت پھوڑ دوں۔ یوں تو خدا کا دیا سب کچھ موجود ہے مگر جمیل سلمہ کو یہ تو ثابت کرنا ہی چاہیے تھا کہ وہ باپ کے دست نگر نہیں خود بھی کمانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"

"تو کیا آپ نے جمیل کی شادی کہیں طے کر دی ہے؟"

"ہاں بھئی میرے بچپن کا دوست ہے۔ اختر یار خان' اس کی بیٹی سے منگنی کر دی تھی۔ پہلے وہ نصیر آباد میں جوتوں کا کاروبار کرتا تھا مگر اب اس خیال سے کہ شادی کے بعد بیٹی قریب ہی رہے۔ یہاں آگیا ہے شو مارکیٹ میں ایک بڑی دکان بھی لے لی ہے اور بتا رہا تھا کہ سوسائٹی میں کوئی مکان بھی خرید لیا ہے۔"

"جمیل کو اس شادی پر کوئی اعتراض تو نہیں؟" شاہد نے پوچھا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو شاہد میاں۔ اس گدھے کی یہ مجال ہو سکتی ہے کہ کوئی اعتراض کرے" احمد علی صاحب نے تیزی سے کہا "حقیقت میں یہ تو اختر دوستانہ تعلقات کا پاس کر رہا ہے ورنہ اس کی بیٹی کے لیے ایک سے ایک اچھا رشتہ مل سکتا ہے۔"

"میرا مطلب تھا کہ ممکن ہے جمیل کسی پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہو" شاہد نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"پڑھی لکھی!" احمد علی صاحب جوش میں آکر بولے "برخوردار وہ لڑکی بی اے پاس ہے۔ کالج کی پڑھی ہوئی۔ یہ نہیں کہ گھر بیٹھ کر امتحان دے دیا ہو اور تمہارے دوست بی اے میں شاندار طریقے پر فیل ہو چکے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں اگر اس بدبخت نے انکار کر دیا تو تمام زندگی پچھتائے گا۔"

"واقعی رشتہ تو ہر لحاظ سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ شاہد نے تائید کرتے ہوئے کہا "اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے چچا جان کہ گھر کی سی بات ہے اگر صرف آپ اور جمیل بھی جا کر لڑکی کو رخصت کرا لائیں تب بھی کوئی کہنے سننے والی بات نہیں ہے ورنہ آج کل کے لوگ تو جیسے شادی بیاہ کو کاروبار سمجھنے لگے ہیں۔ لڑکی کے نام اتنی جائداد لکھی جائے'

مہرا تنے ہزار سے کم کا نہ ہو' چڑھاوے میں اتنا زیور آنا چاہیے۔ دلہن کے کم سے کم سات جوڑے ریشمی اور سات سوتی ضرور ہوں وغیرہ وغیرہ۔"

"خوش رہو برخوردار! ایسی سمجھداری کی باتیں کرتے ہو کہ جی خوش ہو جاتا ہے" احمد علی صاحب جیسے کھل اٹھے "تمہارے لیے ٹھنڈا پانی وغیرہ منگواؤں؟"

"ارے نہیں چچا جان' اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے۔"

"برخوردار ذرا ایسی دانش مندی کی باتیں جمیل سلمہ کو بھی سکھاتے رہا کرو۔ اسے تو جیسے دین دنیا کا ہوش ہی نہیں ہے۔ جب خون پسینہ ایک کر کے کمائیں گے بچہ جی تو ساری قدر و قیمت معلوم ہو جائے گی۔"

"اچھا چچا جان' اب اجازت دیجئے اس طرف کسی کام سے آیا تھا۔ سوچا آپ کو بھی سلام کرتا چلوں" شاہد نے اٹھتے ہوئے کہا اور سلام کر کے دکان سے نیچے اتر آیا۔

○☆○

سوسائٹی میں دو تین پراپرٹی ایجنٹوں کے دفاتر سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد شاہد آخر کار یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ کوئی ایک ڈیڑھ ماہ قبل اختیار خان جوتے والوں نے مکان نمبر ۱۴۴ بارہ لاکھ میں خریدا ہے۔ شاہد محض ایک اندازے پر یہ دوڑ دھوپ کر رہا تھا۔ احمد علی صاحب کی زبان سے فوزیہ اور سوسائٹی کا ذکر سن کر معاً اسے یہ گمان ہوا کہ شاید یہ وہ فوزیہ نہ ہو جو دو مرتبہ جمیل کو مل چکی ہے۔ جمیل کی طبیعت سے بڑی حد تک واقف ہونے کی بنا پر شاہد کو معلوم تھا کہ جو لڑکی ہاتھ آ کر نکل جائے' جمیل اسے کبھی نہیں بھولتا اور جب بھی موقع ملتا ہے اس سے اپنی ہار کا بدلہ لینے کی کوشش کرتا ہے اس کا خیال تھا کہ اگر یہ وہی فوزیہ ہوئی تو شاید جمیل' عذرا کا پیچھا چھوڑ کر فوزیہ کی طرف متوجہ ہو جائے۔

مکان نمبر ۱۴۴ تلاش کرنا کچھ ایسا دشوار ثابت نہیں ہوا' اصل پریشانی یہ معلوم کرنا تھی کہ آیا اس میں رہنے والی فوزیہ وہی فیروزی ساری والی لڑکی ہے' جو مون لائٹ کلب میں پہلی مرتبہ ملی تھی یا کوئی اور۔ مگر تقدیر سازگار تھی۔ شاہد ابھی کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اگلا قدم کیا ہونا چاہیے کہ اس نے مین روڈ کی جانب سے فوزیہ کو ایک سہیلی کے ساتھ آتے دیکھا۔

فوزیہ نے بھی اسے دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔

"ارے شاہد صاحب!" وہ خود ہی اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی "آپ یہاں کیسے؟"

"آپ کے سوال کا جواب تو میں ابھی عرض کرتا ہوں" شاہد بولا "پہلے یہ بتائیے کہ آپ اس سامنے والے مکان میں رہتی ہیں؟"

"جی ہاں غریب خانہ یہی ہے۔"

"بس تو پھر مجھے ایک لوٹا پانی اور ایک جائے نماز منگوا دیجئے میں دو رکعت نماز شکرانے کی ادا کرنا چاہتا ہوں" شاہد نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کیوں' خیریت تو ہے؟"

"اب تک تو نہیں تھی مگر اب نظر آنے لگی ہے" شاہد نے جواب دیا "آپ تو بیس روپے گز والا کپڑا پانچ روپے گز میں خرید کر چلی آئیں اور مصیبت آ گئی میری۔ چچا جان دکان پر واپس آئے تو گویا قیامت آ گئی۔ جمیل نے اپنی جان بچانے کے لیے کہہ دیا کہ میں تو پچیس روپے فی گز بتانے والا تھا مگر شاہد نے کہا کہ یہ کپڑا پانچ ہی روپے گز کا ہے۔ بس صاحب چچا جان میرے سر ہو گئے کہ ابھی جا کر اس لڑکی کو تلاش کرو اور باقی ڈھائی سو روپے وصول کر لاؤ۔ ورنہ میں یہیں دکان سے کان پکڑ کے گھسیٹتا ہوا تمہیں تمہارے باپ کے پاس لے چلوں گا چنانچہ گزشتہ ایک ہفتے سے سارے شہر کی خاک چھانتا پھر رہا ہوں اور بڑی مشکل سے آپ کے گھر کا پتا معلوم ہوا ہے۔"

"اچھا بھئی فوزیہ میں چلتی ہوں" فوزیہ کی سہیلی نے کہا اور ایک دو باتوں کے بعد رخصت ہو گئی۔

"تو آپ ڈھائی سو روپے وصول کرنے آئے ہیں؟" فوزیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"آپ ڈرائنگ روم کھول کر مجھے اطمینان سے بیٹھنے کا موقع دیں تو میں اس سے بہتر بہانہ سوچنے کی کوشش کروں گا۔ فی الحال تو کوئی اور بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے" شاہد سر کھجاتے ہوئے بولا۔

"ماشاء اللہ بڑے صاف گو واقع ہوئے ہیں" فوزیہ نے ایک ہلکا قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا "اچھا تو پھر تشریف لائیے۔"

فوزیہ نے ڈرائنگ روم کھول کر شاہد کو بیٹھنے کے لیے کہا اور خود گھر میں چلی گئی۔ تقریباً دس منٹ کے بعد واپس آئی تو تنہا نہیں تھی۔ ساتھ میں ایک ٹرے بھی تھی جس پر چائے مختلف لوازمات کے ساتھ موجود تھی۔

"تعالباً آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں میں نے ایک لوٹا سادے پانی کے لیے کہا تھا" شاہد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں نے سوچا کہ پہلے آپ اس پر فاتحہ پڑھ دیں۔ نماز بعد میں پڑھ لیں گے۔" فوزیہ نے چائے بناتے ہوئے جواب دیا۔

"اگر آپ اسی طرح ایڈوانس سوچنے کی عادی ہیں تو مجھے یقین ہے کہ میں جس کام کے لیے آیا ہوں وہ ضرور ہو جائے گا" شاہد نے چائے کی پیالی لیتے ہوئے کہا۔

"کام کی نوعیت کا پتا چلے تو میں کچھ سوچوں۔"

"ابھی عرض کرتا ہوں" شاہد نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"یہ اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے والد صاحب نے کچھ سینڈلوں کا اسٹاک گھر میں تو نہیں رکھا ہوا ہے۔"

"جی نہیں" فوزیہ نے مسکراتے ہوئے کہا "اگر کوئی بھولا بھٹکا گاہک گھر پر آجاتا ہے تو ہم اسے دکان پر بھیج دیتے ہیں۔ یوں اگر آپ کہیں تو میں اپنے سینڈل بھی اندر رکھ آؤں۔"

"خیر آپ کے سینڈلوں سے تو مجھے کوئی خطرہ نہیں" شاہد نے جواب دیا "مجھے معلوم ہے کہ بہنیں دھمکیاں تو بہت دیتی ہیں مگر ان سے ہوتا ہواتا کچھ نہیں ہے۔"

"آپ مذاق ہی مذاق میں بڑی سنجیدہ باتیں کہہ جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے بہت سنبھل کر گفتگو کرنا ہو گی۔ فوزیہ نے کہا "فرمایئے' میں سن رہی ہوں۔"

"دیکھئے میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں ایک دوسرے کے سامنے زیادہ بننے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے" شاہد نے سنجیدگی سے کہا "مجھے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کون ہیں اور جمیل سے آپ کا کیا رشتہ متوقع ہے۔ اسی طرح آپ کو بھی یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ

آپ کا گاہے گاہے ملنا اس لیے تھا کہ آپ اپنے طور پر جمیل کے بارے میں اندازہ لگانا چاہتی تھیں۔ اب اگر آپ یہ بتا دیں کہ آپ دونوں کے والدین جو کچھ سوچ رہے ہیں تو جمیل کے متعلق اپنی اچھی یا برعکس رائے قائم کرنے کے باوجود آپ اس کا احترام کریں گی تب تو میں آگے کچھ کہنے کی ہمت کروں ورنہ دوسری صورت میں ساری داستان یہیں ختم ہو جاتی ہے اور ہماری مزید گفتگو کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔"

فوزیہ ایک لمحے کے لیے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

"شاہد بھائی!" آخر کچھ دیر کے بعد وہ بولی "میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتی کہ جمیل صاحب کسی لڑکی کا آئیڈیل بن سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ رواج صحیح ہے یا غلط مگر میں اپنی تعلیم اور آزادی کے باوجود تسلیم کرتی ہوں کہ شادی کے معاملے میں والدین کا کیا ہوا فیصلہ اولاد کے فیصلوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ دانش مندانہ اور اپنے اعتبار سے مفید ہوتا ہے۔ میں صرف اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ میرے والدین نے میرے حق میں جو کچھ بھی فیصلہ کیا ہے' میں کوشش کروں گی کہ اگر وہ مجھے پسند نہیں بھی ہے تب بھی اس کے آگے سر جھکا دوں اور یہ امید رکھوں کہ آخر کار وہی میرے حق میں بہتر ثابت ہو گا۔"

شاہد نے چونک کر فوزیہ کی طرف دیکھا اور اسے جمیل کی قسمت پر بے اختیار رشک آنے لگا۔ وہ سچ مچ بڑا خوش نصیب تھا کہ فوزیہ جیسی بلند کردار لڑکی اس کی زندگی کی ساتھی بننے کے لیے تیار تھی۔ شاہد کو یقین آگیا کہ اگر یہ شادی ہو گئی تو فوزیہ ان لڑکیوں میں سے ہے جو پتھر کو تراش کر ہیرا بنا دیا کرتی ہیں۔ اس نے خلوص دل سے فوزیہ کو اس فیصلے پر مبارک باد دی اور اس کے بعد تقریباً ایک گھنٹے تک اس سے گفتگو کر کے جب وہ باہر نکلا تو ہر طرح مطمئن و مسرور نظر آرہا تھا۔

○☆○

ٹیکسی اسٹیشن کی طرف چلی تو شاہد نے جمیل کا آفر کیا ہوا سگریٹ سلگا کر ایک گہرا کش لیا اور پچھلی سیٹ سے کمر ٹیک کر ٹانگیں پھیلاتے ہوئے بولا۔

"یار' میں سوچتا ہوں کہ جہاں تک لڑکیوں کا تعلق ہے شاید ہی کوئی اتنا خوش نصیب ہو جتنے کہ تم ہو۔"

"درایں چہ شک" جمیل نے جواب دیا "اور اگر فارسی نہ سمجھتے ہو تو اردو میں اس کا مطلب ہوا اس میں کیا شک ہے مگر یہ احساس آج تمہیں کس سلسلے میں ہوا؟"

"بس یوں ہی" شاہد نے جیسے ٹالنے کی کوشش کی "اچھا یہ تو بتاؤ کہ چچا جان جس لڑکی سے تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں، تمہیں نام بھی معلوم ہے اس کا؟"

"تمہارا مطلب ہے وہ اختریار خان جوتے والے کی بیٹی؟" جمیل نے کہا "تو بھئی ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میں نے اس تذکرے میں کبھی اتنی دلچسپی ہی نہیں لی۔ نام یقیناً کچھ ہو گا اور امی نے بتایا بھی ہو گا مگر مجھے بالکل یاد نہیں۔ ویسے جوتے والے کی بیٹی ہے۔ لفٹی، چپل، سینڈل جیسا ہی کوئی نام ہونا چاہیے۔"

"اگر میں کہوں، اس کا نام فوزیہ ہے۔"

"تو کچھ نہیں۔ جانے کتنی بیکار لڑکیوں کے والدین انہیں کار آمد بنانے کی امید میں خوب صورت نام رکھ دیتے ہیں۔"

"مگر میری تفتیش کے مطابق یہ وہی فیروزی ساری والی فوزیہ ہے۔" شاہد نے بتایا۔

"کیا کہہ رہے ہو!" جمیل کی انگلیوں سے سگریٹ گرتے گرتے بچا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں آج صدر بازار گیا تھا۔ سوچا چچا جان کو بھی سلام کرتا چلوں۔ دکان پر پہنچا تو وہاں اختر صاحب مع اپنی صاحب زادی فوزیہ کے موجود تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی پھر سوچا کہ تم نے اس دن فوزیہ کے ہاتھ تہائی قیمت پر کپڑا بیچ دیا تھا شاید اسی کے لالچ میں آج وہ اپنے والد کے ساتھ کچھ اور کپڑا لینے آئی ہے۔ مگر جب وہ لوگ چلے گئے تب چچا جان نے مجھ سے پوچھا "کہو میاں، بھابی پسند آئی" اور پھر خود ہی وضاحت کرتے ہوئے بولے کہ یہ میرے دوست اختر تھے اور میں اسی لڑکی سے اس گدھے جمیل سلمہ کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟" جمیل کی حیرت دیکھنے کے قابل تھی۔

"میں نے کبھی آج تک تم سے مذاق کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کوئی ایسی بات تو نہیں جسے تم چیک نہ کر سکو" شاہد نے جواب دیا۔

"کمال ہے، میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک جوتے والے کی بیٹی اتنی حسین

اور ماڈرن ہو سکتی ہے۔"

"بھئی اختر صاحب نے اپنی بیٹی کو نئے زمانے کے مطابق تعلیم و تربیت دلائی ہے۔"

جمیل کچھ سوچ رہا تھا۔

"اب تو خیر تم عذرا کے ساتھ جا رہے ہو تمہیں فوزیہ کی کیا پروا ہو سکتی ہے مگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو میں یہ ضرور سوچتا کہ تمہارے بارے میں جو کچھ فوزیہ نے کہا ہے، اسے تمہارا ذوق شکار کس طرح گوارا کرے گا۔ اب تک تو تم نے کسی سے ہار نہیں مانی ہے مگر فوزیہ کو کیسے جیتو گے؟"

"کیا کہا ہے اس نے میرے بارے میں؟"

"کیا خبر، چچا جان ہی بتا رہے تھے کہ فوزیہ نے تمہارے ساتھ شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ بھلا میں بی اے پاس ہو کر ایک بی اے فیل سے کیسے شادی کر سکتی ہوں۔ جمیل صاحب کی قابلیت ہی کیا ہے، میں ابھی کئی سال انہیں پڑھا سکتی ہوں۔ اس کے علاوہ میں دو تین مرتبہ ان کی طبیعت کا اندازہ لگانے کے لیے ہی ان کے سامنے آئی تھی۔ ہر لڑکی کے پیچھے جوتیاں چٹخانے والا میرا شوہر نہیں ہو سکتا۔"

"یہ فوزیہ نے کہا ہے؟" جمیل نے سرخ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کہا تو اسی نے ہے مگر تمہیں کیا، نہ تمہیں پہلے اس سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ اب ہو سکتی ہے۔" شاہد نے بے پروائی سے جواب دیا اور ٹیکسی کی کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

اس کے بعد اسٹیشن پہنچنے تک ان دونوں کے درمیان مزید کوئی گفتگو نہیں ہوئی مگر شاہد دیکھ رہا تھا کہ جمیل کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا ہے۔ ٹیکسی رکی تو اس نے اسی کھوئے ہوئے انداز میں اتر کر کرایہ ادا کیا اور سوٹ کیس اٹھا کر پلیٹ فارم نمبر ایک کی طرف چلا جہاں گیٹ پر کھڑے ہوئے ٹکٹ چیکر کے کہنے کے مطابق تغلق آباد جانے والی ٹرین کو لگنا تھا۔ اسٹیشن کی گھڑی پونے آٹھ بجا رہی تھی۔

"یہاں رک کر عذرا کا انتظار نہیں کرو گے" شاہد نے پوچھا "یا پھر اس سے پلیٹ فارم پر ہی ملنے کی بات طے ہوئی ہے؟"

"بھئی جس طرح ہم آ گئے اسی طرح وہ آ سکتی ہے" جمیل نے رکے بغیر آگے بڑھتے

ہوئے کہا۔

جب وہ پلیٹ فارم پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ عذرا ان سے پہلے پہنچی ہوئی ہے۔ اٹیچی کیس آج بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ کل ہی کی طرح فرسٹ کلاس ویٹنگ روم کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ ٹرین آنے میں ابھی کافی وقت تھا۔ طے ہوا کہ چل کر ریفرشمنٹ روم میں چائے پی جائے۔

"اب آپ لوگ تو جا ہی رہے ہیں" شاہد نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "اس لیے آج کی چائے میری طرف سے ہو گی۔ گویا بطور ایک الوداعی پارٹی کے۔"

"معاف کرو بھیا" جمیل نے ہاتھ جوڑے "کل پتا نہیں کیسی بوتلیں لا کر دی تھیں کہ چار بجے تک سوتے ہی رہ گئے۔ آج کہیں تمہاری چائے پی لی تو قیامت ہی کو آنکھ کھلے گی۔"

"کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے" شاہد مسکرایا "اس اعتبار سے تمہاری آنکھیں تو اس وقت بھی بند ہی ہونا چاہئیں۔"

"تم اس دور کی بات کر رہے ہو جب چشمہ ایجاد نہیں ہوا تھا" جمیل نے جواب دیا "آج کل محبت چار آنکھیں رکھتی ہے۔"

"عذرا صاحبہ بہت خاموش ہیں کیا بات ہے" شاہد نے عذرا کی طرف دیکھا۔

"نہیں تو" عذرا نے کچھ گھبرا کر کہا "بات تو کچھ بھی نہیں۔"

چائے پی کر باہر آئے تو آٹھ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ عذرا ہجوم کی نگاہوں سے بچنے کے لیے ریلوے بک اسٹال کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جمیل بھی شغل بیکاری کے طور پر ایک رسالہ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ رسالہ دیکھتے دیکھتے اس نے یونہی دیکھنے کے لیے کہ ٹرین آ رہی ہے یا نہیں، پلیٹ فارم پر نظر دوڑائی اور چونک کر رہ گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر فوزیہ چلی آ رہی تھی۔ اس نے آج بھی وہی فیروزی ساڑی باندھ رکھی تھی۔ عذرا نے اسے چونکتے دیکھ لیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

"غضب ہو گیا" جمیل گھبرائی ہوئی آواز میں بولا "میرے والد صاحب بھی پلیٹ فارم

پر موجود ہیں۔"

"اب کیا ہو گا؟" عذرا بھی گھبرا گئی۔

"ابھی ٹرین آنے میں بیس پچیس منٹ باقی ہیں۔ تم لیڈیز ویٹنگ روم میں جا کر بیٹھو، میں معلوم کرتا ہوں کہ وہ کیوں آئے ہیں؟"

عذرا نے سہمے ہوئے انداز میں سر ہلایا اور اٹیچی اٹھا کر لیڈیز ویٹنگ روم کی طرف چل دی۔

"شاہد بھیا تم اب گھر جاؤ" جمیل نے شاہد سے کہا جو بک اسٹال کے دوسرے کنارے پر ایک انگریزی اخبار دیکھ رہا تھا۔

"کیوں خیریت؟" شاہد نے پوچھا "ٹرین آنے میں وقت ہی کتنا رہ گیا ہے۔ تم لوگوں کو رخصت کر کے ہی جاؤں گا۔"

"ناں بھئی اتنا ہی ساتھ دینا کافی ہے۔ تم اب چلے ہی جاؤ۔"

"آخر معاملہ کیا ہے؟"

افوہ یار، بھئی تو بحث کے بغیر کوئی بات مان لیا کرو" جمیل جھلا کر بولا۔

"آئیں" شاہد نے جمیل کو غور سے دیکھا "کیس سیریس معلوم ہوتا ہے۔ اچھا دوست ہم تو راضی بہ رضا ہیں۔ تم لائے تھے چلے آئے، تم کہتے ہو جاؤ، چلے جاتے ہیں۔"

"اب جا بھی چکو کسی طرح سے" جمیل نے گھور کر فوزیہ کی طرف دیکھا۔ وہ شاید کسی کو تلاش کر رہی تھی۔

"یہ تم اس وقت کسے دیکھ رہے ہو؟" شاہد نے بھی گھوم کر اس طرف دیکھنا چاہا مگر جمیل اسے زبردستی بازو سے پکڑ کر گیٹ کی طرف لے چلا۔

"پلٹ کر مت دیکھنا ورنہ پتھر کے ہو جاؤ گے" وہ اسے گیٹ کے باہر دھکا دیتا ہوا بولا "خدا حافظ۔"

"خدا حافظ" شاہد نے ایک دبی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور گنگناتا ہوا باہر چل دیا۔

جمیل تیز قدموں سے واپس بک اسٹال تک آیا۔ فوزیہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔

جمیل نے ٹائی کی گرہ درست کی۔ بالوں پر ہاتھ پھیرا ایک نظر لیڈیز ویٹنگ روم کی طرف ڈالی اور فوزیہ کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ خادم آداب بجالاتا ہے" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

فوزیہ نے ایک نگاہ جمیل کو دیکھا اور پھر ادھر ادھر جیسے کسی کو تلاش کرنے لگی۔

"میں نے کہا یہ خادم آداب بجالاتا ہے" جمیل نے دوبارہ کوشش کی۔

"اوہ آپ ہیں" فوزیہ نے جیسے پہچانتے ہوئے کہا "معاف کیجئے گا خادم صاحب' میں نے سنا نہیں تھا کہ آپ بجا رہے ہیں۔ یوں بھی اسٹیشن کے شوروغل میں آپ کو اگر کوئی چیز بجانا ہی تھی تو ذرا زور سے بجاتے۔"

"آپ کسی کو تلاش کر رہی ہیں؟" جمیل نے پوچھا۔

"جی ہاں' دراصل بے خیالی میں اندر چلی آئی اور پلیٹ فارم ٹکٹ خریدنا یاد نہیں رہا" فوزیہ نے بتایا "میں نے ایک قلی کو سو روپے کا نوٹ دے کر ٹکٹ خریدنے بھیجا تھا' اسی کو دیکھ رہی ہوں۔"

"بس تو پھر سو روپے کے نوٹ پر فاتحہ پڑھ لیجئے۔ وہ اب واپس نہیں آئے گا" جمیل نے کہا۔ کیا میں آپ سے اپنے ساتھ ایک پیالی چائے پینے کی درخواست کر سکتا ہوں۔"

فوزیہ نے اپنی گھڑی دیکھی "مگر خادم صاحب' میں اسٹیشن کی چائے پسند نہیں کرتی۔"

"تو پھر آیئے باہر چلتے ہیں۔"

"مگر آپ کے ساتھ تو میں نے ابھی کسی کو دیکھا تھا۔"

"جی ہاں میرا دوست تھا مجھے چھوڑنے آیا تھا مگر وہ اب چلا گیا ہے۔"

"حیرت ہے۔ آپ کا دوست ساڑی باندھتا ہے" فوزیہ نے چونک کر پوچھا۔

"جی ہاں کبھی کبھی" جمیل نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "وہ بھی صرف آپ جیسی کسی حسین لڑکی کو حیرت زدہ کرنے کے لیے۔"

"میرا خیال ہے کہ میں نے اس کے ہاتھ میں ایک اٹیچی کیس بھی دیکھا تھا" فوزیہ نے کہا۔

"اٹیچی نہیں سوٹ کیس اور وہ میرے ہاتھ میں تھا" جمیل نے جواب دیا "وہ دیکھئے بک

اسٹال کے پاس رکھا ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ میں اٹیچی اور سوٹ کیس میں تمیز نہیں کر سکتی؟"

"قصور آپ کا نہیں دور سے چیزیں چھوٹی ہی نظر آتی ہیں" جمیل نے کہا "مگر میرا خیال ہے یہ بحث چائے کی پیالیوں پر زیادہ گرمی سے جاری رکھی جا سکتی ہے۔"

"مگر آپ مجھے چائے کیوں پلانا چاہتے ہیں" فوزیہ نے جمیل کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

"سنا ہے چائے سے چاہ بڑھتی ہے۔ میں آپ کو اپنا مستقل گاہک بنانا چاہتا ہوں۔ میرا مطلب ہے اپنی دکان کا" جمیل نے سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

"خوب یاد دلایا" فوزیہ نے کہا "وہ جو جارجٹ کا تھان آپ نے مجھے دیا تھا۔ وہ تو یہیں کا بنا ہوا تھا مگر آپ نے اس پر میڈ ان انگلینڈ کی مہر لگا رکھی تھی۔"

"جی ہاں۔ انگلینڈ والوں کو احساس کمتری سے بچانے کے لیے ایسا کرنا پڑتا ہے" جمیل نے فوراً جواب دیا "اس کے علاوہ آپ جانتی ہیں کہ لوگ غیر ملکی چیزیں زیادہ پسند کرتے ہیں۔ سنا ہے اس طرح زرمبادلہ ضائع ہونے کا خطرہ نہیں رہتا۔"

"دوسرے الفاظ میں بزرگوں نے سچ ہی کہا ہے کہ گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے۔"

"آپ نے وہ مثل بھی تو سنی ہوگی کہ گھی بنائے سالنا اور بڑی بہو کا نام۔"

"اس کا محل استعمال یہاں کیا تھا۔"

"میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس میں مرغی کھانے والوں کا اتنا قصور نہیں جتنا اسے بنانے اور پکانے والوں کا ہے۔" جمیل نے جواب دیا۔ "وہ مرغی پکاتے ہیں مگر دال معلوم ہوتی ہے۔"

"گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب تک پلیٹ سے کڑکڑانے کی آواز نہ آئے آپ اسے مرغی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے؟"

"فوزیہ صاحبہ اصل مرغی تو پیٹ میں جا کر بھی کڑکڑاتی ہی رہتی ہے۔"

ریسٹورنٹ آ گیا تھا۔ دونوں اندر پہنچے۔ جمیل نے چائے کا آرڈر دیا۔

"پھر تو واقعی آپ جیسے لوگوں کو گھر کی مرغیوں سے مایوسی ہی ہوتی ہوگی۔ ان بے

چاریوں کو کڑکڑانے کی تعلیم نہیں دی جاتی" فوزیہ نے کہا۔

"زیادہ کڑکڑانے کا تو خیر میں بھی قائل نہیں ہوں" جمیل بولا "مگر دیکھئے نا یہ تو معلوم ہونا ہی چاہیے کہ گھر میں گوشت کا ناغہ نہیں ہے۔"

"گویا اتنی بحث کے بعد یہی ثابت ہوا کہ مرغی اپنی جان سے گئی اور کھانے والوں کو مزا نہیں آیا۔"

"میں پھر عرض کروں گا فوزیہ صاحبہ کہ اس میں مرغی والوں کا قصور زیادہ ہے۔ ویسے مرغیوں کو بھی بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وہ اب گھروں سے نکل کر گھوروں تک پہنچنے لگی ہیں اور گھورے کی مرغی تو آپ جانتی ہی ہیں نہ انڈے کی نہ گوشت کی۔"

"مگر سوال یہ ہے کہ انہیں گھوروں تک لے جانے والا کون ہے" فوزیہ میز پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

"کون ہے؟" جمیل نے پوچھا۔

"مرغے" فوزیہ نے سادگی سے کہا "آپ نے دیکھا نہیں کہ آج کل کے مرغے کس طرح مرغیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں خاص طور سے ہمارے عزیزوں میں ایک مرغا ہے۔ وہ تو اس سلسلے میں اتنا ہرجائی ہے کہ جب دیکھو کسی نہ کسی مرغی کے پیچھے بھاگتا ہوا ملے گا۔"

"تو آخر مرغیاں گھروں سے نکلیں ہی کیوں کہ جو کوئی مرغ ان کا پیچھا کرے۔"

ویٹر نے چائے کی ٹرے لا کر ان کے سامنے رکھ دی۔

"تو آپ کا مطلب ہے کہ مرغیاں بس اپنے ڈربوں میں بند بیٹھی رہیں۔" فوزیہ نے چائے بناتے ہوئے کہا۔

"بالکل ڈربوں سے نکلنے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ مرغوں سے چھیڑ چھاڑ کرنا چاہتی ہیں۔"

"معاف کیجئے" فوزیہ نے چائے کی پیالی جمیل کی طرف بڑھائی "ہماری مرغیاں مرغوں سے چہلیں کرنے نہیں نکلتیں۔ آپ اپنے مرغوں کو سمجھا دیں کہ وہ آئندہ سے مرغیوں کے پیچھے بھاگنا بند کردیں۔"

"گویا آپ کی مرغیاں گھروں سے نکلنے سے باز نہیں آئیں گی۔ معاف کیجئے ایسی

صورت میں ہمارے مرغوں پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔"

"کیوں نہیں لگائی جاسکتی۔ آخر وہ دوسری مرغیوں کے پیچھے بھاگتے ہی کیوں ہیں جبکہ ان کے اپنے گھر میں مرغیاں موجود ہوتی ہیں۔"

"آپ کو کیا معلوم کہ گھروں کی مرغیاں ذرا ذرا سی بات پر کس بری طرح چونچ مارنے کو دوڑتی ہیں" جمیل بولا۔

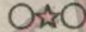
"یقیناً اس میں بھی آپ کے مرغوں ہی کی زیادتی ہوگی" فوزیہ نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"دیکھئے اب یہ بحث ذاتیات پر آگئی ہے" جمیل نے مسکراتے ہوئے کہا "اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ میں آپ کے ان عزیزوں کے مرغ کو اس بات پر آمادہ کرلوں گا کہ وہ دوسری مرغیوں کا پیچھا نہ کیا کرے تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟"

"میں کوئی امید تو نہیں دلاتی مگر کوشش کروں گی کہ گھر کی مرغی اس کی آوارگی کو بھول جائے" فوزیہ نے پیالی رکھ کر کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"گویا اس بات کا امکان ہے کہ ہم دونوں مل کر کوئی پولٹری فارم کھول لیں" جمیل نے پوچھا۔

"شاید!" فوزیہ نے جواب دیا اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل گئی۔



عذرا نے پلیٹ فارم پر تغلق آباد جانے والی ٹرین کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ گونجتے سنی جو دم بہ دم دور ہوتی جارہی تھی پھر شاید آؤٹر سگنل پار کرتے ہوئے ٹرین کے انجن نے الوداعی سیٹی دی اور عذرا ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اٹھ کھڑی ہوئی، شاہد اب تک واپس نہیں آیا تھا۔

وہ اب لیڈیز ویٹنگ روم میں اٹیچی پر کہنیاں ٹکائے اس کے قدموں کی چاپ کی منتظر تھی۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے پریشان کن سوالات ابھر رہے تھے۔ کیا شاہد کے والد کو سب کچھ معلوم ہوگیا ہے۔ آخر شاہد واپس کیوں نہیں آیا۔ کہیں وہ اسے اپنے ساتھ پکڑ کر گھر تو نہیں لے گئے۔ کیا اب بات اس کے ابا جان تک پہنچ جائے گی؟

عذرا نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی نو بج رہے تھے۔ اس نے اٹیچی اٹھائی اور ویٹنگ روم

سے باہر آ گئی۔ کچھ دیر پہلے جو پلیٹ فارم' ہجوم در ہجوم لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اب بالکل سنسان نظر آ رہا تھا۔ تھکے تھکے بھاری قدموں سے وہ گیٹ سے نکلی اور ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئی۔

اسٹیشن سے گھر تک کا راستہ ڈوبتی ہوئی دھڑکنوں کے ساتھ طے ہوا۔

"مس صاحبہ' اسپتال آ گیا" ڈرائیور نے کہا۔

عذرا اپنے خیالات سے چونکی' دروازہ کھول کر نیچے اتری۔ ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور اٹیچی اٹھائے کوٹھی کی طرف چلی۔ اس کے قدم کسی ہارے ہوئے سپاہی کی طرح جھجک جھجک کر اٹھ رہے تھے۔ عقبی دروازے کا قفل کھولنے سے پہلے اس نے آنکھوں کے گوشوں میں جمع ہو جانے والے آنسوؤں کو ساڑی کے پلو سے پونچھا مگر اندر قدم رکھتے ہی چونک پڑی۔ ڈاکٹر عزیز الحق صاحب سامنے ہی کھڑے تھے۔ عذرا کے جسم کا رواں رواں کانپ کر رہ گیا۔ وہ یہ بات بالکل بھول گئی تھی کہ ڈاکٹر صاحب اسی وقت اسپتال سے واپس آتے ہیں۔

"کہاں گئی تھیں؟" ڈاکٹر صاحب نے سخت لہجے میں پوچھا۔

عذرا خاموش کھڑی رہی۔

"میں پوچھتا ہوں کہاں سے آ رہی ہو؟" ڈاکٹر صاحب نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"اسٹیشن سے" عذرا نے جیسے کوئی فیصلہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کیوں گئی تھیں؟"

"ان مسرتوں کو تلاش کرنے جو آپ نے میری زندگی سے نکال پھینکی ہیں۔" عذرا کے لہجے میں بغاوت کا رنگ نمایاں تھا۔ "میں شاہد سے محبت کرتی ہوں۔ شاہد مجھے اپنانا چاہتا ہے۔ ہم اپنی پسند پر آپ کے فیصلے کی توثیق چاہتے تھے مگر آپ نے اس شادی کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ہمارا مطالبہ کوئی ناجائز مطالبہ نہیں تھا۔ مذہب و قانون ہمیں اپنی زندگی کا ساتھی منتخب کرنے کا حق دیتا ہے۔ مگر آپ نے یہ حق ہم سے چھین لیا۔ اس کے بعد ہمارے سامنے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ جو حق آپ محض اپنی خوشی کی خاطر ہمیں دینے پر آمادہ نہیں ہیں' اسے ہم اپنی خوشی کی خاطر خود حاصل کر لیں۔ ممکن ہے

آپ اسے خودسری اور بغاوت قرار دیں لیکن یہ بغاوت ہے تو ہمیں آپ نے اس پر مجبور کیا تھا۔"

یہ کہتے کہتے عذرا کی آواز بھرا گئی۔ جذبات کا جو متلاطم سمندر وہ اب تک اپنی آنکھوں میں بند کئے بیٹھی تھی صبر و ضبط کی تمام بندشیں توڑ کر بہہ نکلا۔ پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی عذرا دیوانہ وار اپنے کمرے کی طرف بھاگتی چلی گئی۔

ڈاکٹر صاحب ایک سکتے کے سے عالم میں اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے۔ ان کی زبان گنگ ہو چکی تھی مگر ذہن میں خیالات کا ایک ہجوم سر اٹھا رہا تھا۔ عذرا کی باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھیں۔ عذرا' شاہد سے محبت کرتی ہے مگر شادی کا پیام لے کر تو جمیل کے باپ آئے تھے۔ آخر یہ معما کیا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ شاہد نے عذرا کو یہ فریب دیا ہو کہ میں اس کے ساتھ عذرا کی شادی کرنے سے انکار کر چکا ہوں۔ اس لیے عذرا کو اس کے ساتھ بھاگ جانا چاہیے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے شاہد کے سیرت و کردار کا اندازہ لگانے میں بھول کی تھی؟

اور تمام رات بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے اس سوال کا جواب پانے میں ناکام رہ کر ڈاکٹر عزیز الحق نے دوسرے دن یہی سوال شاہد سے پوچھ لیا۔

اسپتال جانے سے پہلے وہ عذرا کے کمرے میں آئے۔ عذرا نے سوجی ہوئی سرخ آنکھوں کے ساتھ ان کی طرف دیکھا اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"میں صرف یہ کہنے آیا ہوں بیٹی کہ میں نے کبھی تمہاری مسرتوں کے راستے میں آنے کی کوشش نہیں کی" ڈاکٹر صاحب بڑے نرم لہجے میں مخاطب ہوئے "میں اسپتال جا رہا ہوں۔ شاہد سے بات کرنے۔ میری واپسی تک کوئی قدم نہ اٹھانا' میں تمہاری خوشیوں کا دشمن نہیں ہوں۔ یقین رکھو جو تم چاہتی ہو وہی ہو گا۔"

عذرا بے اختیار چونک پڑی۔ اپنی ہر آرزو کے جواب میں وہ یہی شفقت بھرا لہجہ سنتی آئی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کوئی خوف ناک خواب دیکھتے دیکھتے اچانک جاگ اٹھی ہو۔ اس کا دل بھر آیا۔ وہ بے اختیار ہو کر اٹھی کہ اپنے شفیق باپ کے قدموں میں گر پڑے مگر گھوم کر دیکھا تو ڈاکٹر صاحب جا چکے تھے۔

O☆O

شاہد صبح ہی صبح اپنی طلبی پر حیران ضرور تھا مگر اسے کچھ مبہم سا اندازہ تھا کہ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ دل مضبوط کر کے ایک فیصلہ کرتا ہوا وہ ڈاکٹر صاحب کے آفس میں داخل ہوا اور سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

"دروازہ بند کر دو" انہوں نے آفس کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ شاہد نے تعمیل کی۔

"آپ یہاں میرے سامنے بیٹھ جاؤ" ڈاکٹر صاحب نے دوسرا حکم دیا۔ شاہد خاموشی سے بیٹھ گیا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں نے تمہیں اس وقت کیوں بلایا ہے؟" ڈاکٹر صاحب چند لمحے اسے غور سے دیکھنے کے بعد بولے۔

"آپ کے بتائے بغیر مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے" شاہد نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔

"ہوں" ڈاکٹر صاحب نے ایک گہری سانس لی "کیسی عجیب بات ہے" انہوں نے سوچا کہ اس لڑکے نے میری بیٹی کو مجھ سے بغاوت پر ابھارنے کی کوشش کی ہے مگر مجھے اپنے دل میں اس کے خلاف نفرت و غصے کا شائبہ بھی محسوس نہیں ہوتا۔ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ شاہد حقیقت میں بے قصور ہے مگر پھر سوال یہ ہے کہ آخر قصوروار کون ہے؟

"ہوں" انہوں نے دوبارہ ایک گہری سانس لی "تم نے عذرا کو اپنے ساتھ فرار ہونے پر آمادہ کیا تھا؟"

آخر وہ ایک دم سے کہہ ہی گئے۔

"جی نہیں" شاہد نے سر اٹھا کر ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر وہ تو یہی کہتی ہے۔"

"اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"اسے غلط فہمی ہوئی یا تم مجھے مزید غلط فہمی میں مبتلا رکھنا چاہتے ہو۔" آخر ڈاکٹر کو ان

مطمئن اور مختصر جوابات پر غصہ آ ہی گیا۔ ان کے اپنے دل میں جذبات و خیالات کا طوفان برپا تھا اور یہ لڑکا اس طرح بیٹھا ہے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

"میں نے تمہیں ایک شریف نوجوان سمجھا تھا۔" ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے "مگر تم نے اپنی شرافت کا اچھا ثبوت دیا ہے۔ اگر تم عذرا کو اپنی زندگی کا شریک بنانا چاہتے تھے تو کیا اس کا جائز اور صحیح راستہ یہی تھا جو تم نے اختیار کیا۔ کیا تم اپنی خواہش کا اظہار اپنے والدین سے نہیں کر سکتے تھے۔ کیا تمہارے والد زمانے کے معروف طریقے پر تمہارا پیام لے کر میرے پاس نہیں آ سکتے تھے اور کیا میں اپنی بیٹی کی خوشی کی خاطر اس پیام کو منظور نہیں کر سکتا تھا۔ بولو، جواب دو۔"

یہ آخری سوال ڈاکٹر صاحب کی زبان سے بے ساختہ ہی نکل گیا تھا۔ ان کا اپنا ارادہ ابھی اس حد تک کھل جانے کا نہیں تھا مگر بات منہ سے نکل چکی تھی۔ شاہد نے اپنے دل میں اٹھتی ہوئی خوشگوار امنگوں کو سردست دباتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھا۔

"میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ عذرا صاحبہ ایک غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور اس کا ثبوت آپ اس طرح حاصل کر سکتے ہیں کہ مجھے ان کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیں اور پوچھیں کہ کیا وہ مجھے شاہد کے نام سے جانتی ہیں، کیا میں نے انہیں تہذیب و اخلاق کی حدود پامال کرنے پر آمادہ کیا تھا؟ جہاں تک میری شرافت کا تعلق ہے تو میرے محترم یقین کیجئے اگر میں راستے میں حائل نہ ہوتا تو آپ کی صاحبزادی رسوائیوں کی تاریکی میں کب کی غائب ہو چکی ہوتیں اور اس سلسلے میں سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہوتی کہ جو لاابالی نوجوان زندگی کو محض ایک کھیل سمجھتے ہوئے اس دلچسپ تجربے سے لطف اندوز ہو رہا تھا، اسے احساس تک نہ ہوتا کہ اس کی سطحی علمیت، محدود فکر اور خود غرض خواہشات نے انسانیت کی کتنی قیمتی متاع برباد کر دی ہے۔ یہ قصہ بڑا تفصیل طلب ہے مگر مختصر طور پر آپ اتنا سمجھ لیں کہ عذرا صاحبہ جس شخص کو شاہد کے نام سے جانتی ہیں وہ میرا ایک اسکول کا ساتھی جمیل ہے۔ ابتدا میں وہ اسپتال میں ملازمت حاصل کرنے کے لیے عذرا صاحبہ سے میرے نام سے متعارف ہوا تھا اور اس نے یہ دیکھ کر کہ عذرا صاحبہ کو شعر و شاعری سے لگاؤ ہے، میری غزلوں کو سہارا بنایا۔ یہاں مجھے اپنی نا سمجھی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ میں اس

کی رسمی دلچسپی کے اس حد تک بڑھ جانے کا متوقع نہیں تھا۔ بہرحال حالات کے عجیب اتفاق سے اس کے بجائے یہ ملازمت مجھے مل گئی اور پھر شاید جمیل نے اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے عذرا صاحبہ سے ملاقاتیں جاری رکھیں۔ خود ہی اپنے باپ کا بھیس بدل کر آپ سے ملا اور جو گفتگو آپ کے اور اس کے درمیان ہوئی اسے انتہائی چالاکی سے ٹیپ کر کے اور عذرا صاحبہ کو سنا کر یہ یقین دلایا کہ آپ اس سے یعنی شاہد سے عذرا کی شادی کرنے سے انکار کر چکے ہیں اور یہ کہ اب اگر وہ اسے چاہتی ہے تو اس محبت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے ساتھ بھاگ چلے۔"

شاہد نے اس کے علاوہ کچھ اور باتیں بھی بتائیں خاص طور پر یہ کہ کس طرح اس نے پہلی مرتبہ گھڑی کو نصف گھنٹے آگے کر کے اور دوسری مرتبہ ایک قلی کو اپنے ساتھ ملا کر فرار کی دو کوششوں کو ناکام کر دیا۔ اسی سلسلے میں اس نے جمیل اور فوزیہ کے بارے میں بھی بتایا اور یہ توقع بھی ظاہر کی کہ فوزیہ جیسی لڑکی امید ہے کہ جمیل کو بہت جلد راہ راست پر لے آئے گی۔

ڈاکٹر صاحب ایک حیرت کے عالم میں یہ داستان سن رہے تھے اور آخر کار جب شاہد خاموش ہوا اور وہ اپنے ذہن میں اس گتھی کو خود بھی اچھی طرح سلجھا چکے تو بے اختیار انہوں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر شاہد کو گلے سے لگا لیا۔"

"خوش رہو بیٹے" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا "تم نے واقعی اپنی شرافت کا اچھا ثبوت پیش کیا ہے۔ کچھ دیر پہلے میں نے غالباً غصے میں یہ بات غلط لہجے میں کہہ دی تھی۔ بہرحال اب عذرا، شاہد سے شادی کرنا چاہتی ہے تو اس کی شادی شاہد ہی سے ہو گی۔ میرا خیال ہے، تمہاری ذہانت نے یہ بات تمہیں سمجھا دی ہو گی کہ عذرا، جمیل سے کبھی بھی متاثر نہیں رہی۔ مجھے امید ہے کہ تم اس غلطی کے لیے اسے برا نہیں سمجھو گے اور مجھے یہ بھی امید ہے کہ عذرا اس غلط فہمی کے انکشاف پر مجھ سے ناراض نہیں ہو گی کیونکہ اس نے جس شاہد کو پسند کیا تھا، میں اسے وہی شاہد دے رہا ہوں۔"

اور پھر ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں اتنی جلد بازی کا مظاہرہ کیا کہ اسی وقت شاہد کو ساتھ لے کر خان صاحب سے ملنے پہنچ گئے۔ اس خفیہ کانفرنس میں جو دونوں بزرگوں کے

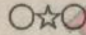
درمیان تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہی، شاہد کو کمرے سے نکالا دے دیا گیا تھا۔ وہ دروازے سے کان لگا کر سننے کے باوجود کارروائی کا ایک لفظ نہیں سن سکا اور اسی طرح کمرے کے سامنے امید و بیم، بے قراری و بے چینی کے ساتھ ٹہلتا رہا جس اضطراب سے کوئی فلمی ہیرو آپریشن تھیٹر کے سامنے ٹہلتا ہے جب اس کی اکلوتی محبوبہ کا آپریشن کیا جا رہا ہو۔

آخر ایک گھنٹے کے بعد جب خان صاحب تسبیح کے دانے اور ڈاکٹر صاحب اپنے مخصوص انداز میں سر ہلاتے ہوئے کمرے سے برآمد ہوئے تو وہ شاہد کو دروازے کے سامنے کھڑا دیکھ کر مسکرائے۔

"جاؤ صاحب زادے، دفتر سے تمہاری آج کی چھٹی" ڈاکٹر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا اور جیب سے بٹوہ نکال کر ہزار ہزار روپے کے پانچ نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

"یہ لو" ڈاکٹر صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "بازار جا کر کوئی بہترین سا ریڈی میڈ سوٹ خرید لو۔ آج عصر کے وقت عذرا سے تمہاری شادی ہو رہی ہے۔"

شاہد کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ تقدیر سے اتنے بڑے انعام کی امید اسے خواب میں بھی نہیں تھی۔



عذرا کو یہ تمام باتیں ایک خواب کے مانند محسوس ہو رہی تھیں۔ ابھی ابھی کل رات کی بات ہے کہ وہ چوری چھپے جیسے کوئی گناہ کر رہی ہو شاہد کے ساتھ کسی نامعلوم اور انجانی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس وقت وہی عذرا تھی وہی شاہد تھا مگر اب ان کی منزل بدنامیوں، رسوائیوں اور خوف و ہراس کے اندھیروں میں چھپی ہوئی نہیں بلکہ ایک رومانوی سکون و اطمینان اور بے اختیار ہونٹوں پر مچلتے ہوئے قہقہوں کی روشنی میں جگمگا رہی ہے۔ پتا نہیں وہ فرار ایک خواب تھا یا یہ بات ایک خواب ہے کہ آج شام اس کی شادی شاہد کے ساتھ ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے شادی میں کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا۔ نہ شہنائیوں کی آوازیں تھیں، نہ مہمانوں کا ہجوم مگر پھر بھی کوٹھی کے در و دیوار جیسے خوشی سے جھوم اٹھے تھے۔

دلہن والوں کی طرف سے اسپتال کا کچھ عملہ تھا یا ڈاکٹر صاحب نے عذرا کی خواہش پر اس کی ایک سہیلی کو بلا لیا تھا جس نے عذرا کو بنا سنوار کر ایک سادہ مگر قیمتی جوڑا پہنا دیا۔

سہ پہر کے چار بجے شاہد بھی اپنے والد اور چند عزیزوں کے ساتھ شیروانی پاجامہ زیب تن کیئے اور محض ایک ہار گلے میں ڈالے کوٹھی پہنچ گیا۔ بارات کو بٹھانے کا انتظام کوٹھی کے چھوٹے سے ہال میں کیا گیا تھا۔ جس وقت خان صاحب تسبیح کے دانے گھماتے ہوئے شاہد کے آگے آگے راہداری طے کر کے ہال کی طرف بڑھ رہے تھے۔ عذرا کی سہیلی نے زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑکی کے سامنے کھڑا کر دیا۔

"بھئی عذرا، تمہارے دولہا تو بڑے شاندار ہیں۔" اس نے ایک چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

عذرا نے نگاہ اٹھا کر دیکھا اور جیسے سن ہو کر رہ گئی "یہ کیا!" اس کے دل نے دھڑک کر پوچھا "یہ شاہد تو نہیں یہ تو جمیل ہے۔"

ایک ثانیے کے لیے عذرا نے محسوس کیا جیسے اس کی مدت سے دبی ہوئی کوئی دیرینہ خواہش پوری ہو گئی ہو مگر فوراً ہی اس کے جذبات بھڑک اٹھے۔ میرے ساتھ فریب کیا گیا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں چیخ کر کہا "میں اس فریب کی قربان گاہ پر اپنی محبت کی قربانی نہیں دے سکتی" اس نے ایک جھٹکے سے سہیلی سے ہاتھ چھڑایا اور میز پر سے اپنا پرس اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" سہیلی نے حیرت سے پوچھا۔

"میں ابھی آئی ایک بہت ضروری کام سے جا رہی ہوں" اس نے پلٹ کر جواب دیا اور اس سے پہلے کہ سہیلی اسے روک سکتی وہ عقبی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ سہیلی غریب پس پردہ حالات سے کہاں واقف تھی، گھبرا کر کمرے سے نکلی تو سامنے سے ڈاکٹر صاحب گزر رہے تھے۔ اس نے چپکے چپکے ڈاکٹر صاحب کے کان میں ساری بات کہہ سنائی۔

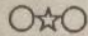
ڈاکٹر صاحب زمانہ شناس انسان تھے۔ گھبرانے اور پریشان ہونے کے بجائے وہ سیدھے شاہد کے پاس پہنچے اسے اٹھا کر ایک طرف لے گئے۔

"شاہد بیٹے میں اس کم عقل لڑکی کی جذباتیت کے لیے تم سے شرمندہ ہوں مگر اسے حالات کا کیا علم ہو سکتا ہے۔ اس نے شاید تمہیں دیکھ لیا اور اب وہ عقبی دروازے سے

نکل کر کہیں گئی ہے۔ میرا خیال ہے یقیناً جمیل کی تلاش میں گئی ہو گی۔"

"آپ پریشان نہ ہوں" شاہد نے سکون سے جواب دیا "میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔ میں عذرا کے پیچھے جا رہا ہوں۔ آپ میری عدم موجودگی کے بارے میں کوئی بھی عذر پیش کر دیں اور اطمینان رکھیں کہ یہ بات میرے علاوہ اور کوئی نہیں جان سکے گا۔"

ڈاکٹر صاحب نے ممنونیت کے انداز میں شاہد کی پیٹھ تھپتھپائی اور ہال کی طرف واپس چلے گئے۔ شاہد کوٹھی سے باہر نکلا اور ایک ٹیکسی پکڑی اور سیدھا جمیل کے گھر روانہ ہو گیا۔



عذرا کی پہلی منزل جمیل کا گھر تھا اور حیرت کا پہلا صدمہ بھی اسے یہیں پہنچا۔

"بیٹی تم کس شاہد کو پوچھ رہی ہو" بیگم صاحبہ نے تعجب سے پوچھا۔ "میرے بیٹے جمیل کا ایک دوست شاہد نام کا ہے تو سہی مگر وہ یہاں نہیں رہتا۔"

"اچھا تو جمیل صاحب کہاں ہیں؟" عذرا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کے علاوہ اور کیا پوچھے۔

"وہ تغلق آباد گیا ہوا تھا کل رات ہی واپس آیا ہے۔" بیگم صاحبہ نے بتایا۔

"میرا مطلب ہے اس وقت کہاں ہیں؟"

"ابھی ابھی گھر سے نکلا ہے، کہہ رہا تھا کہیں کلب ولب جا رہا ہے۔"

"شکریہ" عذرا نے جواب دیا اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر آکر ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

"مون لائٹ کلب" اس نے ڈرائیور کو ہدایت کی۔

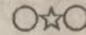
آخر یہ کیا اسرار ہے؟ شاہد صاحب نے تو کہا تھا کہ یہ ان کا گھر ہے اور یہ بزرگ خاتون کہتی ہیں کہ یہاں جمیل رہتا ہے۔ پھر جمیل وہاں شادی کرنے پہنچا ہوا ہے اور یہ کہہ رہی ہیں، وہ کلب گیا ہے۔ عذرا تمام راستے انہی خیالات میں کھوئی گم سم بیٹھی رہی۔ ٹیکسی کلب کے سامنے رکی تو وہ چونک کر نیچے اتری۔ کرایہ ادا کیا اور کلب کے گیٹ کی طرف بڑھی۔ اس نے دیکھا کہ ڈرائیور نے غلطی سے اسے گارڈن روڈ والے گیٹ پر اتار دیا ہے

مگر دوسری طرف واپس جانے کے بجائے وہ اسی گیٹ سے اندر داخل ہوگئی۔ گیٹ سے سیمنٹ کی پختہ روش کلب کی عمارت تک جاتی تھی۔ دونوں جانب سرسبز جھاڑیوں کی لان اور بیڈ منٹن کے کورٹس بنے ہوئے تھے۔ عذرا اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی کلب کی طرف جارہی تھی کہ اچانک اس کے کانوں میں کسی کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ آواز جھاڑی کے دوسری طرف سے آرہی تھی۔ عذرا کے قدم آپ ہی آپ رک گئے۔ یہ آواز اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ شاہد کسی سے باتیں کر رہا تھا۔

"میں نے کہہ دیا کہ مجھے غزلیں سنانے کی کوشش مت کیجئے جمیل صاحب!" فوزیہ نے کہا "مجھے شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں ہے اور اگر یہ غزلیں آپ کی ہیں اور آپ شاعر ہیں تو یہ آپ کی خوبیوں میں نہیں خامیوں میں ایک اضافہ ہے۔"

جمیل صاحب۔۔۔! عذرا چونکی۔ "تو یہ سچ مچ جمیل ہی ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ آج کل کچھ تقدیر ہی خراب ہے جو پانسہ پھینکتا ہوں الٹا پڑتا ہے" جمیل نے جلدی سے کہا "خدا کی قسم فوزیہ، یہ غزلیں میری نہیں ہیں اور نہ میں شاعر ہوں۔ یہ تو میرے دوست شاہد کا کلام ہے۔ لڑکیاں اس کا کلام بہت پسند کرتی ہیں۔ تمہیں بھی اس خیال سے سنا رہا تھا کہ ممکن ہے اسی طرح تمہارا غصہ اتر جائے۔"



عذرا کو محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ تو یہ فریب اسے جمیل دے رہا تھا یقیناً غزالہ کے یہاں اس کا پہلا تاثر ہی اس کے بارے میں درست تھا اور اپنی فریب خوردگی کا احساس ہوتے ہی عذرا کا غصہ جو اب تک اپنے باپ کے خلاف تھا، جمیل کے خلاف نفرت کے ایک طوفان کی شکل میں پھٹ پڑا۔ اس نے ایک درمیانی راستے سے جھاڑیاں پار کیں اور آنکھوں سے چنگاریاں برساتی ہوئی غیظ و غضب کے عالم میں جمیل اور فوزیہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ جمیل گھاس پر بیٹھا ہوا تھا۔ عذرا کو دیکھتے ہی گھبرا کر کھڑا ہوگیا اور اس کے کھڑے ہوتے ہی عذرا کا سیدھا ہاتھ پورے جوش و طاقت کے ساتھ اٹھا اور ایک زبردست تھپڑ نے جمیل کا منہ پھیر دیا۔

"تو تم شاہد نہیں ہو اور اب تک اس کا نام اختیار کر کے مجھے فریب دیتے رہے تھے۔"

وہ انتہائی غم و غصے میں چیخی۔ دنیا کی کوئی سزا تمہاری اس ذلالت اور کمینگی کے لیے کافی نہیں ہوسکتی مگر میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ کسی افسوس ناک انجام سے پہلے ہی تمہارے فریب کا پردہ چاک ہوگیا۔ شاید یہ سبق میرے لیے ضروری بھی تھا۔ میری خود سر آزادی اس ٹھوکر کے بغیر راہ راست پر نہیں آسکتی تھی۔"

یہ کہہ کر عذرا تیزی سے واپس گھومی اور روش کی طرف بھاگتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کی دھند گہری ہوتی چلی جارہی تھی مگر وہ کپکپاتے ہونٹوں کو سختی سے دانتوں میں بھینچے بے تحاشا گیٹ کی طرف بھاگی چلی آرہی تھی۔

اچانک اس کے بھاگتے ہوئے قدم یوں رک گئے جیسے انہیں زمین نے تھام لیا ہو۔ آنسوؤں کی دبیز چادر کے دوسری طرف کسی کا مسکراتا ہوا چہرہ دھندلا دھندلا سا نظر آرہا تھا۔ عذرا نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں اور اشکوں کے موتی پلکوں سے ٹوٹ کر شبنم کی طرح گھاس پر بکھر گئے۔

"عذرا!" شاہد نے بڑی محبت سے آواز دی۔ عذرا نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔

اور پھر کچھ دیر کے لیے وقت کی رفتار ٹھہر گئی۔ زمان و مکاں کی تمام قیود آن واحد میں ٹوٹ گئیں۔ عذرا کے سامنے مشاعرے کی رات کا منظر پوری رعنائیوں کے ساتھ موجود تھا۔ اس کی روح نے تو پہلے ہی اپنے ساتھی کو پہچان لیا تھا اور وہ کشش، وہ خود سپردگی جو اس نے اس رات اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کی تھی، ایک پل میں اس کے پورے وجود پر چھا کر رہ گئی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر شاہد کی آنکھوں میں صرف ایک بار جھانکا اور بے اختیار اس کے قدموں میں جھک گئی۔

شاہد نے بڑے پیار سے دونوں بازو پکڑ کر اسے اٹھایا۔ ایک ہاتھ سے اس کا جھکا ہوا سر اوپر کیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں کو چھوتے ہوئے بولا۔

توقعات کی حد ہے نہ خود فریبی کی
نظر ملا کے ذرا آپ مسکرا دیجئے

عذرا کا سر بار حیا سے جھک کر شاہد کے شانے سے آلگا۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور نے ہارن بجایا اور دونوں چونک کر ایک جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔

○☆○

"اور اب" فوزیہ نے جمیل کے ساتھ چلتے ہوئے کہا "اگر اس تھپڑ نے آپ کی آنکھیں کھول دی ہوں تو ہم آپ کے مجوزہ پولٹری فارم پر غور کر سکتے ہیں۔"

"سچ" جمیل کا افسردہ چہرہ کھل اٹھا "یعنی..... یعنی..." وہ ہکلایا "اس تھپڑ کے باوجود!"

"جی ہاں" فوزیہ شوخی سے بولی "اس تھپڑ کے باوجود بشرطیکہ جس طرح اس نے آپ کا منہ پھیر دیا ہے عقل بھی پھیر دے۔"

"آمین!" جمیل نے شرارت مگر خلوص دل سے کہا "ساتھ ہی خدا سے یہ بھی دعا کرو کہ جس طرح اس نے ہمارے تمہارے دن پھیرے ہیں اسی طرح تمام سر پھرے نوجوانوں کے دن بھی پھیر دے اور وہ کوئی تھپڑ کھانے سے پہلے ہی ساری دنیا کی لڑکیوں کو اپنی ماں بہن سمجھنا شروع کر دیں یعنی..." وہ رک کر بولا "میرا مطلب ہے اپنی بیوی کے علاوہ۔"

(ختم شد)